اسلام میں شیعہ

تالیف:
علامہ محمد حسین طباطبائی

ترجمہ:
ڈاکٹر شاہد چوہدری

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldior Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

Zehra Shabbir

786
488

اسلام میں شیعہ

No. 18014 Date 20/3/11
Status
Section
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

تالیف:

علامہ محمد حسین طباطبائی

ترجمہ:

ڈاکٹر شاہد چوہدری

Gift
p.o.Box: 91375-3131-Mashhad- Islamic Republic Of Iran
International Relations of Astan Quds Razavi
E-Mail :irc@imamrezashrine.com

بسم الله الرحمن الرحیم

طباطبائی، محمد حسین، ۱۹۰۳ – ۱۹۸۱.
اسلام میں شیعه/تألیف محمد حسین طباطبائی؛ ترجمه شاهد چوهدری.- قم: انصاریان، ۱۳۸٤ = ۲۰۰۵.
۲۲۱ ص.
اردو.

ISBN: 964-438-641-8

کتابنامه بصورت زیرنویس.
عنوان اصلی: شیعه در اسلام.
۱.شیعه – عقاید. ۲. شیعه - تاریخ. الف. چوهدری،شاهد، مترجم.
ب. عنوان.
BP۲۱۲/٥/ط۲ش۹۰٤٦ ۲۹۷/٤۱۷۲

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar#2
KARACHI
PH. 7211795

اسلام میں شیعه

(شیعه در اسلام)

مؤلف: علامه محمد حسین طباطبائی قدس سره
مترجم: دکتر شاهد چوهدری
پبلشر: انصاریان پبلیکیشنز – قم
طبع دوم ۱۴۲۵ – ۱۳۸۳ – ۲۰۰۵
طبع سوم ۱۴۲۶ – ۱۳۲۸۴ – ۲۰۰۵
چاپخانه: ثامن الائمه(ع)- قم تعداد صفحات: ۲۲۴ ص
تعداد: ۲۰۰۰ نسخه سایز: mm۲۱۰ X ۱۴۵
ISBN:۹۶۴-۴۳۸-۶۴۱-۸

جمله حقوق بحق ناشر محفوظ هیں

انصاریان پبلیکیشنز
پوست بکس نمبر ۱۸۷
قم – جمهوری اسلامی ایران
فون نمبر ۷۷٤۱۷٤٤-۲٥۱-۰۰۹۸ فاکس ۷۷٤۲٦٤۷
Email:ansarian@noornet.net
www.ansariyan.org & www.ansariyan.net

فہرست مضامین

	صفحہ
مقدمہ از ڈاکٹر سید حسین نصر	۷
مقدّمہ مصنّف	۱۸
پہلا حصہ	
مذہب شیعہ کی پیدائش اور اس کی ترقی	۲۲
اقلیّت شیعہ کے اکثریت سنی سے جدا ہونے کی وجہ اور اختلافات کا پیدا ہونا	۲۵
جانشینی اور علمی رہبری کے دو مسائل	۲۷
انتخابی خلافت کا سیاسی طریقہ اور شیعہ عقیدہ کے ساتھ اختلاف	۲۹
امیرالمومنین حضرت علیؑ کی خلاف اور آپ کا طریقۂ کار	۳۵
حضرت علیؑ کی پانچ سالہ خلافت کے دوران شیعوں نے جو استفادہ کیا	۳۸
خلافت کا معاویہ کی طرف چلے جانا اور پھر موروثی سلطنت میں تبدیل ہونا	۴۱
شیعوں کے لئے سب سے مشکل زمانہ	۴۳
بنو اُمیّہ کی سلطنت کا قیام	۴۵
دوسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت	۴۸
تیسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت	۵۱
چوتھی صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت	"
پانچویں صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت	۵۳
دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت	۵۴

	صفحہ
بارہویں سے پندرہویں ہدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت	۵۵
شیعوں کے مختلف فرقے	۵۶
اصلی فرقے	"
شیعہ زیدیہ	۵۸
اسمٰعیلیہ شیعہ اور ان کے مختلف فرقے	۵۹
نزاریہ، مستعلیہ، دروزیہ اور مقنّعہ فرقے	۶
بارہ امامی شیعہ اور ان کا زیدیہ اور اسمٰعیلیہ کے ساتھ فرق	۶۳
خاتمۂ باب	۶۶
بارہ امامی شیعوں کی تاریخ کا خلاصہ	۶۷
دوسرا حصہ	
شیعوں کا علمی تفکّر	۶۹
مذہبی تفکّر کے معنی	"
اسلام میں مذہبی تفکّر کے بنیادی مآخذ	"

	صفحہ
تین طریقے جن کی طرف قرآن مجید مذہبی تفکر کے لئے راہنمائی کرتا ہے۔	۷۰
ان تین طریقوں کے درمیان فرق	۷۴
پہلا طریقہ۔ ظواہر دینی اور ان کی اقسام	۷۵
صحابہ کی احادیث	۷۶
کتاب وسنت کے بارے میں دوبارہ بحث	"
قرآن مجید کا ظاہر اور باطن	۷۸
قرآن مجید کی تاویل	۸۲
حدیث کی بحث کا تتمہ	۸۵
حدیث پر عمل کے بارے میں شیعوں کا طریقہ	۸۷
اسلام میں عام تعلیم وتعلّم	۸۸
شیعہ اور نقلی علوم	۸۹
دوسرا طریقہ۔ عقلی بحث	۹۱
عقلی، فلسفی اور کلامی تفکّر	"
اسلام کے فلسفی اور کلامی تفکر میں شیعوں کی پیش قدمی	۹۲

صفحہ

- فلسفہ اور دوسرے تمام عقلی علوم میں شیعوں کی انتھک کوشش ۹۴
- شیعوں میں فلسفہ کیوں باقی رہ گیا؟ ۹۵
- شیعوں میں سے چند ایک مشہور علمی شخصیتیں "
- **تیسرا طریقہ ـ کشف** ۹۸
- انسان اور عرفانی ادراک "
- اسلام میں عرفان کا ظہور ۹۹
- عرفان نفس اور اس کے منصوبوں کی طرف کتاب و سنت کی رہنمائی ۱۰۲

تیسرا حصہ:

- اسلامی عقائد کے بارے میں بارہ امامی شیعوں کا نظریہ ۱۰۵
- **خداشناسی (خدا کی پہچان)** "
- زندگی اور حقیقت کے پیش نظر دنیا پر ایک نظر (خدا کی ضرورت) ۱۰۶
- انسان اور جہان کے رابطے پر ایک نظر ۱۰۷
- باب کا خاتمہ (خدا کی وحدانیت) ۱۱۱
- ذات اور صفات ۱۱۲
- خدا کی صفات کے معنی ۱۱۳
- صفات کے معنی میں مزید وضاحت ۱۱۵
- صفات فعل ۱۱۶
- قضاء و قدر ۱۱۷
- انسان و اختیار ۱۱۹
- **پیغمبر شناسی** ۱۲۲
- ہدف کی طرف عمومی ہدایت "
- خصوصی ہدایت ۱۲۵
- عقل اور قانون ۱۲۷
- وہ مرموز شعور جسے وحی کہا جاتا ہے ۱۲۸
- پیغمبر اور نبوت کی عصمت ۱۲۹
- پیغمبر اور آسمانی دین ۱۳۰
- پیغمبر اور وحی و نبوت کی حجت ۱۳۳
- خدا کے پیغمبروں کی تعداد ۱۳۵
- اولوالعزم صاحب شریعت پیغمبر "
- حضرت محمدؐ کی نبوت ۱۳۶
- پیغمبر اکرمؐ اور قرآن مجید ۱۴۱

	صفحہ
معاد کی پہچان	۱۴۵
انسان روح اور بدن سے بنا ہے	"
دوسرے نظریئے سے روح کی حقیقت کے بارے میں بحث	۱۴۷
موت اسلامی نظریئے کے مطابق	۱۴۸
برزخ	۱۴۹
روز قیامت، رستخیز	۱۵۱
ایک اور بیان	۱۵۴
پیدائش کا جاری رہنا	۱۶۰
امام شناسی	۱۶۱
امام کے معنی	"
امامت اور اسلامی حکومت میں پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی	۱۶۲
گزشتہ کلام کی تائید و تصدیق میں	۱۶۷
معارف الٰہی کے بیان میں امامت کا مفہوم	۱۷۴
نبی اور امام میں فرق	۱۷۶
باطنی اعمال میں امامت کا مفہوم	۱۷۷
ائمہ اطہارؑ اور اسلام کے دینی پیشوا	۱۸۲

	صفحہ
بارہ اماموںؑ کی زندگی پر اجمالی نظر	۱۸۴
امام اوّلؑ	"
امام دومؑ	۱۸۹
امام سومؑ	۱۹۲
امام چہارمؑ	۱۹۹
امام پنجمؑ	۲۰۱
امام ششمؑ	۲۰۲
امام ہفتمؑ	۲۰۴
امام ہشتمؑ	۲۰۵
امام نہمؑ	۲۰۸
امام دہمؑ	۲۰۹
امام یازدہمؑ	۲۱۰
امام دوازدہمؑ	۲۱۲
خاص نائبین	۲۱۳
امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (عام عقیدے کے مطابق)	۲۱۴
امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (خاص عقیدے کے مطابق)	۲۱۵
چند مسائل اور ان کے جوابات	۲۱۷
خاتمہ ۔ شیعوں کا معنوی پیغام	۲۱۸

مقدّمہ

بقلم ڈاکٹر سیّد حسین نصر

یہ کتاب جو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے اس منصوبے کی ایک کڑی ہے جو مغرب میں شیعہ مذہب کا تعارف کرانے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگرچہ بعض مغربی (یورپی) دانشوروں نے گزشتہ چند صدیوں کے دوران اسلام کے مختلف پہلوؤں اور اسلامی تمدّن کے بارے میں تحقیقات کی ہیں لیکن یہ تحقیقات تعصّب اور خودغرضی سے خالی نہیں ہیں کیونکہ ان میں اسلام کو منحرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یورپی محققّین کے تمام منابع اور مآخذ و حوالہ جات یا دستاویزات جو اسلام کے بارے میں تحقیقات کے لئے استعمال میں لائے گئے ہیں، وہ سب کے سب اہلسنّت والجماعت کے ہیں اور جب بھی قرآن مجید، حدیث، سیرت النبیؐ، فقہ اور کلام کے بارے میں کوئی بات ہوتی ہے تو عام طور پر اس کا مقصد اہلسنّت والجماعت کا نظریہ ہی مدِّنظر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نظریئے میں کمی بیشی آچکی ہو یا خودغرضی اور تعصّب کی بناء پر بیان کیا گیا ہو۔

یورپی زبانوں کی موجودہ کتابوں میں مذہبِ شیعہ کو ایک فرعی اسلامی فرقہ کہہ کر تعارف کرایا گیا ہے اور اس مذہب کے تمام نظریات اور اسبابِ پیدائش کو صرف اور صرف سیاسی اور سماجی بیان کیا گیا ہے اور اُن دینی اسباب و علل کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے جو مذہبِ شیعہ کی پیدائش کا باعث ہوئے ہیں اور حتّیٰ کہ مذہبِ شیعہ کے متعلق تحقیقات میں کلی طور پر زیادہ حصّہ اسماعیلیہ کے بارے میں ہے اور اثنا عشری (بارہ امامی) شیعہ مذہب پر حتّیٰ کہ اسماعیلیہ کے برابر بھی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

شاید اس امر کا اصلی سبب وہ محدودیت ہو جو مغرب (یورپ) کے تاریخی ریکارڈ میں موجود ہے۔ مغرب نے اب تک دو بار اسلام سے براہِ راست رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایک بار اندلس اور صقلیہ (سسلی) میں عربوں کے ساتھ اور دوسری بار مشرقی یورپ میں ترکوں کے ساتھ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ دونوں بار رابطہ اہلِ سنّت طریقے پر ہوا تھا اور شیعہ مذہب کے ساتھ بہت ہی محدود بلکہ تقریباً پوشیدہ رہا ہے، وہ بھی بعض اسماعیلیہ مکاتب کے ساتھ یعنی صلیبی جنگوں کے دوران فلسطین میں اور شاید بعض دوسرے مکاتب کے ساتھ اندلس میں۔

یورپ نے کبھی بھی موجودہ زمانے کے علاوہ دنیائے تشیّع اور خصوصاً ایران (جس کا مذہب تشیّع ہے) کے ساتھ مستقیم اور براہِ راست تعلق و رابطہ نہیں رکھا اور اسی طرح اسلامی ایران کے تہذیب و تمدّن اور ثقافت کے ساتھ بھی پہلی مرتبہ ہندوستان میں آشنائی پیدا کی تھی۔

بہرحال ان وجوہات کی بناء پر اور شاید یورپی لوگوں کی کوششوں سے جو انہوں نے اسلام کے ان عقلی پہلوؤں کی تحقیر کے بارے میں روا رکھی ہیں جن کا عقلی پہلو بہت ہی مضبوط ہے، مذہبِ شیعہ جیسا کہ حقیقی طور پر تاریخِ اسلام میں موجود تھا اور آج بھی ہے۔ ایرانی، عرب، پاکستانی اور ہندی کروڑوں مسلمانوں کا مذہب ہے، اس مذہب کے پیروکاروں کے علاوہ اور کہیں بھی پہچانا نہیں گیا ہے اور یورپ میں مشرق شناسوں کے نظریات کو قبول کر لیا گیا ہے جن میں کہا گیا تھا کہ مذہب شیعہ دینِ اسلام میں ایک بدعت ہے اور یہی بات یورپی ممالک میں عام ہے اور حتّیٰ کہ بعض لوگ مذہبِ شیعہ کو اسلام کے دشمنوں کی ایجاد سمجھتے ہیں جو اسلام کے سینکڑوں سال بعد رونما ہوا ہے۔ اگر ان چند کتابوں پر ایک نظر ڈالیں جو مشہور ہونے کے علاوہ یا تو مذہبِ شیعہ سے مربوط و منسلک ہیں اور یا ان میں تشیّع کے بارے میں اشارہ کیا گیا ہے، تو ہمارے دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

ان نظریات و عقائد کے پیشِ نظر اور جدید طریقۂ فکر جو آہستہ آہستہ یورپی دنیا اور خصوصاً اینگلو سیکسن ممالک کے متعلق تحقیقات کے لئے حکمفرما ہے، مذہبِ شیعہ کے بارے میں تحقیقات کی ضرورت کا احساس روز بروز زیادہ ہو جاتا ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد بتدریج امریکہ میں اور پھر انگلستان میں یہ نظریہ وجود میں آیا کہ ایک دین کا بہترین تعارف کرانے والا وہ شخص ہے جو اس دین کے اندر سے اس پر غور کرے یعنی اس دین کا پیرو کار ہوتے ہوئے اس پر غور و خوض اور تحقیق کرے اور صرف عینی یا ظاہری طور پر دین کی تعریف و توصیف اسی شخص کا خاصہ ہے کہ یا تو بالکل دین پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور یا اس خاص دین کو جس کا مطالعہ کر رہا ہے شروع ہی سے بے بنیاد اور مطرود سمجھتا ہے لہٰذا یہ کسی وجہ سے بھی کافی نہیں ہے۔

اس حقیقت کی دریافت یورپ کے دانشوروں، مفکّروں اور خاص کر جوانوں کی روز افزوں ضروریات تھیں کیونکہ عیسائیت کے ضعف کے باعث امریکہ اور یورپ میں مادّیت کے عجیب غلبے کی وجہ سے ایک خلاء پیدا ہو چکا تھا اور اس خلاء کو مشرقی ادیان (مذاہب) سے استفادہ کر کے پُر کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ میں بتدریج مذاہب اور ادیان کے بارے میں تحقیقات کے لئے مراکز کھولے گئے اور حتّی المقدور انہی ادیان کے مآخذ اور دانشوروں اور محققّوں سے مطالب سمجھنے کے لئے استفادہ کیا گیا۔ البتہ ظاہر ہے کہ کلی طور پر اسلام اور خاص طور پر مذہب شیعہ اس تحقیق سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔

اس تحریک کے بانیوں اور چلانے والوں میں سے ایک پروفیسر کنتھ مورگن (KENNETH MORGAN) امریکی دانشور اور کالگیٹ (COLGATE) یونیورسٹی کے استاد ہیں جنہوں نے اپنی عمر کا ایک حصّہ مشرق (ایشیا) میں گزارا تھا اور تمام مذاہب کے اکثر بڑے بڑے علمائے دین، اساتذہ اور معنوی و روحانی بزرگوں کے ساتھ براہِ راست رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

پروفیسر کنتھ مورگن نے جن کی شہرت زیادہ تر کتاب "اسلام صراط المستقیم" کے ذریعے ہوئی ہے جو مسلمانوں کے ایک گروہ نے لکھی تھی اور استاد محمود شہابی نے اس کتاب کا "باب تشیّع" لکھا تھا۔ چند سال پہلے کالگیٹ یونیورسٹی میں ایک مرکز یا شعبہ کھولا تھا تاکہ اس میں دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کے حقیقی نمائندے جمع ہوں اور اب پروفیسر کنتھ مورگن خود اس شعبے کے چیئرمین ہیں اور ذہین طلباء کے ایک گروہ کی رہنمائی بھی کر رہے ہیں۔

پروفیسر مورگن نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ مشرقی مذاہب کے منابع اور مآخذ کو شائع کر کے ان

مذاہب کے حقیقی پیروکاروں کے عقائد و نظریات کے مطابق یورپی اور مغربی لوگوں کو ان کا تعارف کرائیں۔

آٹھ سال پہلے جب راقم نے پہلی بار اس مرکز کو دیکھا تو اس وقت مذہب شیعہ کے بارے میں کتابوں کی کمی کی بات چلی تھی۔ سوربن یونیورسٹی کے پروفیسر ہنری کوربن نے شیعہ فکر کے تعارف کرانے میں بہت ہی اہم اور شایانِ شان خدمات انجام دی ہیں، لیکن سب سے پہلے تو ان کی کتابیں فرانسیسی زبان میں ہیں اور اس کے ساتھ بہت اونچے معیار کی ہیں اور پھر ان کا سروکار عرفان و حکمت سے ہے اور دین کے عام پہلوؤں کو سامنے نہیں لاتے۔ دو یا تین کتابیں جو انگریزی زبان میں موجود ہیں، ان میں سے اکثر عیسائی مبلّغوں کے ذہن کی اختراع ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر شیعہ مذہب کو ردّ اور ختم کرنے میں گزاری ہے۔

اتفاق سے ایک دو سال بعد ۱۹۶۴ء کے موسم گرما میں پروفیسر مورگن ایران تشریف لائے۔ ان دنوں میں استادِ ارجمند حضرت علّامہ محمد حسین طباطبائی کے شاگردوں میں سے تھا اور ہفتہ میں چند بار "درکہ" میں حاضر ہوتا تھا جو ان کا موسم گرما کا ٹھکانا تھا اور ان کے بیکراں علم و فضل سے اپنی محدود استعداد اور صلاحیّت کے مطابق خوشہ چینی کیا کرتا تھا۔ ایک دن جناب مورگن کے ہمراہ حضرت علّامہ طباطبائی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پروفیسر مورگن پہلی ہی نظر میں علامہ طباطبائی کی معنویت و روحانیت کے شیفتہ ہوگئے اور امریکی پروفیسر نے احساس کیا کہ وہ ایک ایسے استاد کے روبرو ہیں جن کا علم و فضل "فکر" کے مرحلے سے آگے نکل کر "عمل" کے مرحلے تک پہنچ چکا ہے اور جو کچھ وہ زبان سے فرماتے ہیں، اس کو محسوس کرتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ درکہ کی تنگ اور خاکی گلیاں پر لطف اور دلکش تھیں۔ وہاں سے واپسی پر میں نے فوراً یورپی لوگوں کے لئے حضرت علّامہ طباطبائی کی زیر نگرانی اور تعاون سے کتابیں لکھنے کا منصوبہ تیار کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور استاد بزرگوار نے تین سال کے عرصہ میں بہت ہی اہم دو کتابیں تحریر کیں جن میں سے ایک کتاب یہی "شیعہ در اسلام" اور دوسری "قرآن در اسلام" تھیں۔[1] اس طرح انہوں نے اپنے علم و دانش کے ذریعے اسلام اور علم کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔

---

[1] مترجم نے "قرآن در اسلام" کا ترجمہ "قرآن میں اسلام" کے نام سے مؤسسہ مطالعات تحقیقات و فرہنگی سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔

اس کتاب کا ترجمہ میں نے آج سے دو سال پہلے انگریزی زبان میں کیا تھا جو ایک مدّت تک امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ اس تجربے کے بعد اور ایسی کتاب کو سمجھنے میں طلباء کا ردِّ عمل دیکھنے کے بعد جو براہِ راست ایک مشہور اسلامی عالمِ دین کے قلم سے لکھی گئی تھی، یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں شائع ہو کر سامنے آرہی ہے۔

دوسری کتاب قرآن مجید کے بارے میں ہے جو ترجمہ کی جارہی ہے اور اسی سلسلے کی تیسری کتاب جو مذہبِ شیعہ کا تعارف کرانے کے لئے ہے وہ شیعہ آئمہؑ کے منتخب اقوال و گفتار کا ترجمہ ہے جو ابھی تک یورپ میں خفیہ خزانے یا مخفی کتاب کی شکل میں موجود ہے۔

بنا بریں کتاب "اسلام میں شیعہ" ایک ایسی کتاب ہے جو جدید تحقیق اور ایک نئے نظریئے یا مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ مذہبِ شیعہ اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کا تعارف ایسے لوگوں سے کرایا جائے جو شیعہ مذہب کے فکری، اسلامی اور شیعی نظریات سے واقفیّت نہیں رکھتے۔

فاضل اور محترم مصنّف نے بغیر اس کے کہ اہلسنّت والجماعت کی توہین ہو، لیکن مذہبِ شیعہ کی حقیقت کے دفاع میں اور اس مذہب کی پیدائش کے بارے میں تحقیق کی ہے اور کوشش کی ہے کہ یہ بات واضح کی جائے کہ مذہبِ شیعہ بالکل اسلام کے اصلی پہلوؤں میں سے ہے۔ مگر انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ شیعہ اور اہلسنّت میں کسی قسم کا تفرقہ یا شگاف پیدا کرنے سے بھی بالکل گریز کیا ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس شیعہ مذہب کا دفاع کر کے انہوں نے اسلام کے ان دو اصلی اور اہم فرقوں میں بحث و گفتگو کو آسان بنا دیا ہے کیونکہ تقریب صرف طرفین کی اصالت کی حفاظت کرنے سے ہی امکان پذیر ہو سکتا ہے۔

ہمارے زمانے کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کتاب کی ضرورت اور اہمیّت شاید فارسی زبان میں بھی انگریزی زبان سے کم نہیں ہے، نہ صرف بیسیوں یا سینکڑوں بلکہ ہزارہا ایرانی نوجوان آج اپنے دین کے بارے میں وقوف اور آشنائی نہیں رکھتے بلکہ بالکل جاہل اور نادان ہیں، اس کے باوجود

وہ اپنے دین اور مذہب سے آشنائی کی ضرورت کا احساس بھی کرتے ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دانش عام علمی اور دینی کتابوں سے استفادہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔

گزشتہ سالوں کے دوران معاشرے کے ایک طبقے میں دینی تعلیمات کے مسئلے نے ایک بہت ہی عجیب صورت حال پیدا کر لی ہے کہ شاید کسی اور معاشرے میں یہ صورت حال بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ حالانکہ مذہبی اقلیتیں اور ایران میں مقیم غیر ملکی افراد اپنے گھروں اور مدرسوں میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ثقافت اور اپنا دین اپنے بچوں کو سکھائیں۔ مسلمانوں کے درمیان جو ایرانی معاشرے میں مکمل اکثریت سے ہیں، بعض طبقات میں دینی تعلیم بالکل فراموش کی جا چکی ہے، والدین نے اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں سے اتار دیا ہے اور ان کو یہ توقع ہے کہ مدارس معجزانہ طور پر اس اہم کام سے عہدہ برآ ہو سکیں گے اور دوسری طرف مدرسے، استادوں اور معلموں کی کمی کی وجہ سے ان مضامین کو پڑھانے سے قاصر ہیں لہٰذا فطری طور پر یہ معجزہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس طرح بتدریج ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جس کو ہر قسم کا مادی سامان میسر ہے اور سوائے معنی و مقصد کے اس دنیا میں وہ جو کچھ بھی چاہیں ان کے لئے فراہم ہو جاتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ کیسے حرکت کریں لیکن یہ نہیں جانتے کہ کہاں جائیں اور چونکہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ مقصد کے پیچھے ہے اور مقصد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور اپنی تمام زندگی کو سراسر بیہودہ و بے معنی سرگرمیوں اور مشغولیات یا مادی و شہوانی کاموں میں نہیں گزار سکتی اسلئے ایک ایسی جماعت بھی ہے جو اس بے مقصدیت سے سخت تنگ ہے، ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ دینی، معنوی اور روحانی تعلیم حاصل کریں لیکن رہنما، استاد اور معلم کا ملنا اور حتیٰ کہ ایسی کتابیں حاصل کرنا جو ان کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی ہوں اور ایسے ہی دینی حقائق، غور و فکر اور شیعہ تاریخ کو ان کے لئے واضح کریں، بہت ہی مشکل ہے۔ ان حالات میں ایسی کتاب چھاپنا اور شائع کرنا جو سب سے پہلے مغربی محققین اور دانشوروں کے لئے لکھی گئی ہو لیکن ایرانیوں کے لئے بھی اسی طرح قابلِ اہمیت ہو، بہت اہم کام ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصنیف اپنی قسم میں بے مثال ہے۔

علامہ طباطبائی نے بہت ہی سادہ زبان میں مذہبِ شیعہ کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہوئے

تاریخ سے لے کر حکمت و عرفان تک وضاحت کی ہے اور ان محدود اور گنتی کے چند صفحوں میں انہوں نے بہت ہی اہم اسلامی معارف کے حقائق کو بیان فرمایا ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے فارسی زبان کے ساتھ دلچسپی رکھنے والا ہر انسان پہلی بار اس کے مطالعے سے شیعہ طرزِ فکر کی شہ سرخیاں پڑھ کر تقریباً بعد کی تحقیقات کے لئے راستہ کھولنے کے لئے چابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ نفیس کتاب ایک ایسی رہنمائی کا کام دیتی ہے کہ اس کی مدد سے وہ انسان جو اب تک دنیائے تشیّع سے نامانوس اور ناآشنا ہے، اس وسیع دنیا میں قدم رکھ سکتا ہے اور ایسے شخص کو یقین و اطمینان رکھنا چاہئے کہ وہ اس رہنما (کتاب) کے ہوتے ہوئے ہرگز گمراہ نہیں ہو گا بلکہ اس حبلِ متین کے ذریعے انشاءاللہ تعالیٰ حقیقی اور آخری مقصد تک پہنچ جائے گا۔

علّامہ طباطبائی ایک بہت بڑے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اور چودہ پشتوں سے ان کا گھرانا تبریز میں مشہور علماء کا مرکز رہا ہے۔ ان کی ولادت ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء کو تبریز میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے آبائی گاؤں میں ہی حاصل کی۔

ابتدائی تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد آپ ۱۹۳۲ء میں نجف اشرف تشریف لے گئے اور دس سال تک اس اہم شیعہ مرکز میں تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہے اور مختلف اسلامی علوم سیکھتے رہے۔ فقہ اور اصول مشہورِ زمان اساتذہ آیت اللہ نائینی اور آیت اللہ کمپانی سے پڑھے اور فلسفہ کی تعلیم سیّد حسین بادکوبی سے حاصل کی جو خود آیت اللہ جلوہ اور آقا علی مدرّس کے شاگردوں میں سے تھے۔ ریاضیات کی تعلیم آقا سید ابوالقاسم خوانساری سے حاصل کی اور اخلاق حاج میرزا علی قاضی سے سیکھا اور پڑھا جو حکمت عملی اور عرفان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی وطن واپس آ گئے۔

علامہ طباطبائی کی تعلیم صرف فقہ کی عام سطح کی تعلیم نہ تھی بلکہ آپ نے قدیم ریاضیات اقلیدس کے اصول سے لے کر مجسطی، بطلیموس اور فلسفہ، کلام، عرفان اور تفسیر میں گہرا مطالعہ کیا اور ان تمام علوم میں اجتہاد کے مرحلے تک پہنچ گئے۔

علامہ طباطبائی کی شہرت تبریز سے نکل کر تہران اور ایران کے دوسرے دینی مدارس میں اس وقت

پہنچی جب آپ دوسری جنگِ عظیم کے واقعات اور بعد میں رونما ہونے والے حادثات و اتفاقات سے مجبور ہوکر اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر قم چلے آئے اور ۱۹۴۶ء میں وہیں سکونت اختیار کرلی اور بغیر کسی شور و غوغا اور صدا و آواز کے تفسیر اور حکمت میں محفل علمی کا آغاز کیا۔ آپ اکثر تہران آتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تہران میں حکمت و فلسفہ اور اسلامی معارف کے شائقین اور دلچسپی رکھنے والوں سے رابطہ قائم ہوگیا تھا اور حتیٰ کہ آپ دین و حکمت کے مخالفوں سے بحث و مناظرہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، لہٰذا آپ نے ان افراد و اشخاص کو عقل و منطق کے ذریعہ فلسفی اور دینی حقائق کا گرویدہ بنالیا تھا جو صراطِ مستقیم سے منحرف ہوچکے تھے۔ آپ نے آخری پچیس[۲۵] سالوں کے دوران نہ صرف دینی اور روحانی طبقے میں بلکہ تجدّد مآب یورپی طرز فکر اور تعلیم یافتہ افراد پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ہر موسم خزاں میں کئی سالوں تک پروفیسر ھنری کوربن اور علاّمہ طباطبائی کے درمیان دانشوروں اور علماء و فضلاء کی مجالس میں دین، فلسفہ اور ان مشکلات و مسائل کے بارے میں جن سے آج دنیا دوچار ہے بحث و گفتگو جاری رہتی تھی اور ایسے ہی وہ مسائل جو آج ایک سالکِ معنوی اور حقیقت کے متلاشی کو درپیش ہیں۔ ان مجالس میں ان پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ ان بحثوں اور جلسوں کے نہایت ہی اہم نتائج برآمد ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معیاری جلسے اور وہ بھی ان وسیع نظریات کے ساتھ آج اسلامی دنیا میں بے نظیر اور بے مثال تھے اور حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے لے کر جب اسلام اور عیسائیت کے درمیان فکری اور معنوی رابطہ ختم ہوچکا تھا، اس کے بعد اسلامی دنیائے شرق اور مغرب کے درمیان ایسا رابطہ کبھی قائم نہیں ہوا تھا۔

حوزۂ علمیّہ (قم کے دینی مدرسے) میں علاّمہ طباطبائی کی اہم خدمات میں سے علوم عقلی کو دوبارہ زندہ کرنا اور علمِ تفسیرِ قرآنِ مجید ہے۔ آہستہ آہستہ آپ نے بنیادی سطحوں پر حکمت و فلسفہ کی تدریس بھی شروع کی جن میں کتاب "شفاء" اور "اسفار" مشہور ہیں۔ ان کی اعلیٰ شخصیت، بہترین اخلاق، صفاتِ حمیدہ اور خاص شاگردوں کے ساتھ حسنِ سلوک نے روز بروز زیادہ سے زیادہ دینی طلباء کو اپنے جلسۂ درس کا گرویدہ اور شیفتہ بنالیا تھا اور طالب علم جوق در جوق ان کی محفلِ درس میں کھنچے چلے آتے تھے۔

یہاں تک کہ آخری سالوں میں آپ کے درس حکمت میں سینکڑوں طلباء موجود رہتے تھے اور تقریباً بیس سال کے عرصے میں بہت زیادہ دانشور اس عالم اسلامی، علامہ طباطبائی کی راہنمائی میں اجتہاد کے درجے تک پہنچ گئے ہیں کہ جن میں سے بعض خود بھی حکمت و فلسفہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

شاید حکمت و فلسفہ کے میدان میں خدمت سے بھی زیادہ اہم طلباء کی بڑی جماعت کی تربیت کا کام تھا جو آپ نے کتابوں کے ذریعہ انجام دیا۔ علامہ طباطبائی کی توجہ زیادہ تر اپنے شاگردوں کی اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس پر تھی۔ درحقیقت انہوں نے اکیلے ہی اس اشخاص کے لئے تربیت کا ایک جدید مرکز اور مکتب کھول دیا تھا جنہوں نے علم اور اخلاق کو یکجا وسعت بخشی اور اس طرح انہوں نے لائق اور باصلاحیت افراد معاشرے کو دیئے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ آموزش و پرورش (تعلیم اور اخلاق) کی یکجائی کی تاکید کی جو ہمیشہ سے اسلامی ثقافت کے اوّلین اصولوں میں سے ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج جدید تعلیمی نظام میں اور حتیٰ کہ قدیم دینی و علمی مدارس میں بھی یہ اصول تقریباً فراموش ہو چکا ہے۔

علامہ طباطبائی کے علمی کارنامے (کتب) مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ **تفسیر المیزان۔**

۲۔ **اصول فلسفہ ریالزم** : جو شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کے اہتمام اور اضافات کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ پانچ جلدوں میں سے تین جلدیں چھپ چکی ہیں اور بقیہ خطی نسخے کے طور پر باقی ہیں۔ اس کی ایک عربی جلد بھی چھپ چکی ہے۔

۳۔ صدرالدین شیرازی کی کتاب "اسفار" پر حاشیہ، "اسفار" کی جدید اشاعت جو علامہ طباطبائی کی زیر نگرانی ہو رہی ہے، لکھا جا چکا ہے اور اس کتاب کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

۴۔ پروفیسر ہنری کوربن کے ساتھ مصاحبے اور بحثیں : دو جلدوں میں۔ ان میں سے ایک جلد "مکتبِ تشیّع" کے سالنامے ۱۳۳۹ ہجری شمسی بمطابق ۱۹۶۰ عیسوی کو شائع ہو چکی تھی اور دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہو رہی ہے۔

۵۔ رسالہ در حکومتِ اسلامی (اسلامی حکومت کے بارے میں ایک رسالہ) جو فارسی، عربی اور جرمن

زبانوں میں چھپ چکا ہے۔

۶۔ حاشیہ کفایہ۔
۷۔ رسالہ در قوّہ و فعل۔
۸۔ رسالہ در اثباتِ ذات۔
۹۔ رسالہ در صفات۔
۱۰۔ رسالہ در افعال۔
۱۱۔ رسالہ در وسائط (وسیلہ)
۱۲۔ الانسان قبل الدّین۔
۱۳۔ الانسان بعد الدّین۔
۱۴۔ رسالہ در نبوّت۔
۱۵۔ رسالہ در ولایت۔
۱۶۔ الانسان فی الدّین۔
۱۷۔ رسالہ در مشتقات۔
۱۸۔ رسالہ در برہان۔
۱۹۔ رسالہ در مغالطہ۔
۲۰۔ رسالہ در تحلیل۔
۲۱۔ رسالہ در ترکیب۔
۲۲۔ رسالہ در اعتبارات۔
۲۳۔ رسالہ در نبوّت و مقامات۔
۲۴۔ منظومہ در رسم الخطِ نستعلیق۔
۲۵۔ علی والفلسفۃ الالٰہیّہ۔
۲۶۔ قرآن در اسلام۔
۲۷۔ شیعہ در اسلام (موجودہ کتاب)

اس کے علاوہ علامہ طباطبائی کے متعدد مقالات اور مضامین مختلف رسالوں مثلاً "مکتبِ تشیّع"، "درسہائے از مکتبِ اسلام" اور "راہنمائے کتاب" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

علّامہ طباطبائی کی اہم ترین کتاب "تفسیر المیزان" ہے کہ اب تک اس کی سترہ جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب زمانۂ حال کی سب سے بڑی تفسیروں میں سے ہے اور جیسا کہ قدیم تفاسیر اپنے اپنے زمانے میں علوم و فلسفہ کے پیشِ نظر قرآنی مطالب کو سمجھنے کے لئے خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔ یہ تفسیر موجودہ زمانے میں موجودہ نسل کے لئے وہی خدمات انجام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ علّامہ موصوف نے اس تفسیر میں جدید روش استعمال کی ہے کہ نصِّ حدیث پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنی آیات کی تفسیر قرآنی آیات سے ہی کی گئی ہے۔ آج علامہ طباطبائی کا تمام وقت اسی تفسیر کو مکمل کرنے پر صرف ہو رہا ہے اور امید ہے کہ آپ جلد ہی اس کو مکمل کر لیں گے۔

علّامہ صاحب بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بغیر کسی جنگ و جدال اور شور و غوغا اور ظاہری زرق و برق کے اپنی سادہ زندگی کو علم و دین اور شاگردوں کی تربیت کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں اور اسی حالت میں بہت مفید اور اہم کتابیں لکھ رہے ہیں۔

موجودہ کتاب بیشک علّامہ صاحب کو پہلی بار ایرانیوں کے ایک طبقے کے طور پر اور مغرب میں اسلام شناس اور ایران شناس کے عنوان سے تعارف کراتی ہے۔ البتہ آپ ایران کے علمی معاشرے میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور اگر اس کتاب کے قارئین بھی اس محدود گروہ میں سے ہوتے تو میں اپنے ناچیز اور نارسا الفاظ کے ساتھ اپنے آپ کو اس بات کی کبھی اجازت نہ دیتا کہ آپ کی اہم شخصیت کے بارے میں کچھ لکھتا لیکن چونکہ ایک بہت بڑی تعداد اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار اس اُستاد بزرگوار کی تصنیفات سے آشنائی پیدا کرے گی اسلئے راقم جو سالہا سال آپکی شاگردی کی سعادت رکھے ہوئے ہے اور اس اہم کتاب کے انگریزی ترجمے کی بھی ذمّہ داری لئے ہوئے ہے، اپنا فرض سمجھتا ہے کہ علّامہ طباطبائی کے بارے میں چند الفاظ لکھے اور اس طرح اپنے نارسا الفاظ میں زمانۂ حال کے اس علم و حکمت کے عظیم ستون کا تعارف کرائے۔

البتہ اس عظیم اور بزرگ شخصیّت کا تعارف کرانے میں قلم قاصر اور عاجز ہے اور کلام و الفاظ آپ کے علم و فضل اور روحانی کمال و درجات کی تعریف نہیں کر سکتے۔ یہ چند صفحات اس علم و فضل کے سمندر میں ایک قطرے کی حیثیّت رکھتے ہیں جس نے آرام و سکون اور خاموشی کے ساتھ اسلامی و ایرانی معاشرے کی بہت زیادہ خدمت کی ہے اور چونکہ آپ خود حال و حقیقت کے درجے تک پہنچ چکے ہیں اس لئے ایک نورانی مشعل کی طرح اپنے عقیدت مندوں، شاگردوں اور آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے دُور دُور تک راستے کو پُرنور بنا دیا ہے اور ان کی فکری اور معنوی زندگی کو ایک نئی روح اور نیا مقصد عطا کر دیا ہے۔

سید حسین نصر

یہ کتاب جس کا نام " اسلام میں شیعہ " رکھا گیا ہے، مذہبِ شیعہ کی حقیقت اور واقعیت کو بیان کرتی ہے جو دو بڑے اسلامی مذاہب تشیع اور تسنن میں سے ایک ہے۔ شیعہ مذہب کی پیدائش اور نشوونما، مذہبی طرزِ فکر اور شیعہ مذہب کے نقطۂ نظر سے اسلامی معارف جیسے موضوعات کے بارے میں ہے۔

مقدّمہ

دین : اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام انسان فطری طور پر اپنے ہمجنسوں کی طرف مائل ہیں، اسی طرح معاشرے اور زندگی میں باہمی اور مجموعی طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کے یہ کام ایک دوسرے سے بے ربط اور لاتعلق نہیں ہیں اور ہر انسان کے گوناگوں اعمال مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا، بولنا، سننا، اٹھنا، بیٹھنا اور چلنا وغیرہ اور اسی طرح ان کے میل جول کے طریقے اگرچہ ظاہری طور پر مختلف اور جدا نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت آپس میں مکمل رابطہ رکھتے ہیں۔ ہر کام کو ہر جگہ اور ہر دوسرے کام کے بعد انجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ہر کام کے لئے موقع و محل اور حساب و کتاب الگ ہوتا ہے۔

پس وہ اعمال و افعال جو انسان اپنی زندگی میں انجام دیتا ہے وہ ایک خاص نظام کے تحت انجام پاتے ہیں کہ انسان ان میں خلاف ورزی نہیں کرتا اور یہ کام دراصل ایک خاص نقطے سے شروع ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ ایک سعادت مندانہ زندگی کا مالک بنے تاکہ اپنی زندگی میں جہاں تک ممکن ہو سکے کامیاب ہو اور تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی آرزوؤں اور امیدوں کو پورا کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں جہاں تک ممکن ہو اپنی بقائے حیات کی خاطر زندگی میں تمام ضروریات اور احتیاجات کو مکمل طور پر پورا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے اعمال و افعال کو ان قوانین سے مطابقت دیتا ہے جو یا تو اس نے اپنی مرضی سے بنائے ہوئے ہیں اور یا دوسروں سے حاصل اور قبول کئے ہیں اور اس طرح زندگی میں ایک معیّنہ طریقہ اپناتا ہے۔ زندگی کی سہولتیں اور دوسرے لوازمات کے لئے کام کرتا ہے، کیونکہ زندگی کی ضروریات کو حاصل کرنا بھی قوانین میں سے سمجھتا ہے۔ لذّت حاصل کرنے اور بھوک پیاس کو مٹانے کیلئے کھانا کھاتا اور پانی پیتا ہے کیونکہ کھانے اور پینے کو اپنی جان بچانے کے لئے ضروری خیال کرتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے کام.....

مندرجہ بالا قوانین وضوابط جو ایک انسان کی زندگی میں جاری اور حاکم ہیں، سب کے سب ایک بنیادی عقیدے پر قائم اور استوار ہیں اور انسان اپنی زندگی میں انہیں پر تکیہ کرتا ہے۔ یہ تکیہ اور بھروسہ ایک ایسا خیال یا گمان ہے کہ انسان اس دنیا میں سے حاصل کرتا ہے کہ خود بھی اسی کا ہی ایک جزو ہے یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو اس (دنیا) کی حقیقت کے بارے میں وہ کرتا ہے اور یہ مسئلہ ان افراد کے مختلف افکار کا مطالعہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے جو دنیا کی حقیقت کے بارے میں مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کو یہی مادّی دنیا تصوّر کرتے ہیں اور انسان کو بھی ایک سو فیصدی مادی مظہر سمجھتے ہیں (یعنی وہ بدن میں روح پیدا ہونے اور پھونکے جانے سے پیدا ہوا ہے اور موت سے مر جائے گا) ان کی زندگی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی مادّی خواہشات اور چند روزہ دنیاوی لذّتوں کو پورا کر سکیں اور ان کی ساری کوششیں اسی راہ میں مصروف رہتی ہیں کہ فطرت کی شرائط اور عناصر کو اپنے لئے مطیع اور فرماں بردار بنالیں۔

اور وہ لوگ جو عام بت پرستوں کی طرح دنیائے فطرت کو ایک خدائے برتر کی مخلوق تصوّر کرتے ہیں جو فطرت سے بالا و برتر ہے اور جس نے اس دنیا کو خصوصاً انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کو اپنی گوناگوں نعمتوں سے نوازا ہے تاکہ اس کی نعمتوں کی خوبیوں اور لذّتوں سے فائدہ اٹھا سکے، یہ لوگ اپنی زندگی کے منصوبے اور پروگرام کو اس طرح بناتے ہیں کہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں اور اس کو ناراض نہ کریں کیونکہ اگر وہ خدا کو راضی کر لیں گے تو یہ نعمتیں ان پر زیادہ ہو جائیں گی اور ہمیشہ کے لئے قائم اور موجود

رہیں گی اور اگر خدا کو ناراض کریں گے تو یہ نعمتیں ان سے چھین لی جائیں گی۔

اور وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھنے کے علاوہ انسان کے لئے ہمیشہ کی زندگی پر ایمان اور اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کو اچھے اور برے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور آخر کار قیامت کے دن پر بھی ایمان رکھتے ہیں مثلاً مجوسی، یہودی، عیسائی اور مسلمان وغیرہ جو اپنی زندگی میں ایک ایسے راستے پر چلنا چاہتے ہیں جس میں اعتقاد اور ایمان شامل ہو اور ایسے ہی اس دنیا اور آخرت میں سعادت کی ضمانت بھی اس میں موجود ہو۔

یہ اعتقاد اور ایمان (یعنی انسان اور دنیا کی حقیقت پر اعتقاد) اور اس کے متناسب قوانین جن پر انسان اپنی زندگی میں عمل پیرا رہتا ہے اس کو "دین" کہا جاتا ہے۔ اگر کسی دین میں کئی فرقے پیدا ہو جائیں تو ہر فرقے کو "مذہب" کہتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں مذہب اہلسنت یا مذہب شیعہ اور عیسائیت میں مذہب ملکانی اور مذہب نسطوری وغیرہ۔

لہٰذا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، انسان ہرگز (اگرچہ وہ خدا پر ایمان بھی نہ رکھے یا خدا کو بالکل ہی نہ مانے تو بھی) دین سے (زندگی کے پروگرام اور منصوبے جو اسکے اعتقادی اصولوں پر قائم ہیں) بے نیاز نہیں ہو سکتا پس دین کا مطلب ہے روشِ حیات یا زندگی گزارنے کا طریقہ اور انسان ہرگز اس سے جدا اور الگ نہیں ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ انسان دین سے نہیں بچ سکتا (دور نہیں رہ سکتا) اور وہ (دین) ایک ایسا راستہ ہے جس کو انسان کے لئے خدا نے کھول رکھا ہے تاکہ اس راستے پر چل کر اس تک پہنچ جائے۔ البتہ جن لوگوں نے دینِ حق (اسلام) کو قبول کر لیا ہے وہ یقیناً خدا کے راستے کو طے کر رہے ہیں اور جن لوگوں نے دینِ حق (اسلام) کو قبول نہیں کیا ہے وہ خدا کے راستے سے منحرف اور گمراہ ہو گئے ہیں اور غلط راستے پر چل رہے ہیں[1]

اسلام :- لغت میں اسلام کے معنی قبول کرنے، ہتھیار ڈالنے اور گردن جھکانے کے ہیں اور قرآن مجید جس دین کی دعوت دیتا ہے اس کو "اسلام" کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا کلی منصوبہ اور پروگرام انسان کا دنیا اور مخلوق کے خدا کے سامنے گردن جھکانا ہے، تاکہ اس گردن جھکانے کی وجہ سے خدائے یکتا اور وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی اور کی

---

[1] لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (سورہ اعراف آیت ۴۴-۴۵)

ترجمہ : (ہوشیار رہو) خدا کی لعنت ہو ان ظالموں اور ستمگاروں پر جو خدا کے راستے (دین) سے لوگوں کو دور اور منحرف کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ دین (راستہ) بھی ٹیڑھا ہو جائے (یعنی ان کی مرضی کے مطابق ہو جائے) تاکہ وہ اسے قبول کر سکیں۔

پرستش یا عبادت[1] نہ کرے اور اس کے فرمان کے علاوہ کسی کی اطاعت نہ کرے جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: "جس کسی نے سب سے پہلے اس دین کو اسلام اور اس کے پیروکاروں کو مسلمانوں کہا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔"[2]

شیعہ: لفظ شیعہ جس کے معنی پیروکار کے ہیں، ان لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی کو آپؐ کے خاندان مطہرؑ کا حق سمجھتے ہیں اور اسلامی معارف میں مکتب اہلبیتؑ کے پیروکاروں میں سے ہیں۔[3]

۱؎ وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (سورۃ النساء آیت ۱۲۵)

ترجمہ: کونسا دین اس سے بہتر ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے حکم کے سامنے تسلیم کر دے (اس کا فرمان مانتے) اور نیکوکار ہو جائے اور ابراہیمؑ کے پاک اور معتدل دین و آئین کی پیروی کرے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (سورہ آل عمران آیت ۶۴)

ترجمہ: اہل کتاب سے کہدو کہ آؤ تاکہ ایک مشترکہ کام (امر) میں تعاون کریں اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ ہی اس کا شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے بعض لوگ دوسروں کو اپنا آقا اور سرور (خدا) نہ بنائیں اور اگر انہوں نے یہ بات نہ مانی تو پھر انہیں کہو: پس تم گواہ رہنا کہ ہم صرف حق کے آگے گردن جھکاتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! خدا کے مقام تسلیم (گردن جھکانے کے مقام میں) داخل ہو جاؤ۔

۲؎ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۸)

ترجمہ: (ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے کہا) خداوندا ہمیں اپنے حکم کے سامنے گردن جھکانے کی توفیق عطا فرما اور ہماری اولاد کو بھی مسلمان امت میں رکھ۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ (سورہ الحج آیت ۷۸)

ترجمہ: یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے، وہی کہ جس نے تمہیں مسلمان کہا ہے۔

۳؎ زیدیہ فرقہ کے اس گروہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو حضرت علیؑ سے پہلے خلیفہ اول و دوم کو بھی مانتے ہیں اور فقہ میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ وہ خلفائے بنو امیہ اور خلفائے بنو عباس کے مقابلے میں حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کی خلافت پر ایمان رکھتے ہیں۔

مذہب شیعہ کی پیدائش اور اس کی ترقی

پہلا حصّہ

(الف) کیفیّت پیدائش :

- مذہبِ شیعہ کی پیدائش، آغاز اور اس کی کیفیّت۔
- اقلیت (شیعہ) کا اکثریت (سنی) سے جدا ہونے کی وجہ اور اختلافات کا پیدا ہونا۔
- جانشینی اور علمی مرجعیّت کے دو مسئلے۔
- انتخابی خلافت کا سیاسی طریقہ اور شیعہ عقیدہ کے ساتھ اس کا اختلاف۔
- امیرالمومنین حضرت علیؑ کی خلافت اور آپ کا طریقۂ کار۔
- حضرت علیؑ کی پانچ سالہ خلافت کے دوران شیعوں نے جو استفادہ کیا۔
- خلافت کا معاویہ کی طرف چلے جانا اور اس کو موروثی سلطنت میں تبدیل کرنا۔
- شیعوں کے لئے سب سے مشکل زمانہ۔
- بنوامیّہ کی سلطنت کا قیام۔
- دوسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- تیسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- چوتھی صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- پانچویں صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک کے دوران شیعوں کی حالت۔
- دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- بارہویں سے چودھویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔

مذہب شیعہ کی پیدائش، آغاز اور اس کی کیفیت

مذہب شیعہ کے ماننے والوں کو سب سے پہلے حضرت علیؑ کے شیعہ یا پیروکار کہا گیا۔ مذہب شیعہ کی پیدائش یا آغاز کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب پیغمبر اکرمؐ اس دنیا میں موجود تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کی ولادت سے لے کر تیئیس ۲۳ سالہ زمانۂ بعثت تک اور تحریکِ اسلام کی ترقی کے دوران بہت سے ایسے اسباب و واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجے میں خود رسولِ خداؐ کے اصحاب میں ایک ایسی جماعت کا پیدا ہونا ناگزیر اور لازمی ہو گیا تھا۔

۱۔ رسول خداؐ کو اپنی بعثت کے اوائل میں ہی قرآن مجید کی آیت کے مطابق حکم ملا کہ اپنے خویش و اقارب کو اپنے دین کی طرف بلائیں۔[۲] لہٰذا آپؐ نے واضح طور پر ان لوگوں کو فرمایا کہ جو شخص تم میں سب سے پہلے میری دعوت کو قبول کرے گا وہی میرا وصی، وزیر اور جانشین ہو گا۔ حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی ان کے ایمان کو تسلیم کر لیا اور اپنے وعدوں کو پورا کیا۔[۳] فطری طور پر یہ بات محال ہے کہ ایک تحریک کا قائد اور رہبر اپنی تحریک کے آغاز میں اپنے یاروں دوستوں میں سے ایک شخص کو اپنے وزیر، جانشین یا نائب کے طور پر سرداروں کے سامنے پیش کرے لیکن اپنے فداکار اور جاں نثار اصحاب اور دوستوں کو اس کا تعارف نہ کرائے یا اسکی صرف وزارت اور جانشینی کو خود بھی قبول کرے اور دوسروں سے بھی قبول کرائے لیکن اپنی دعوت اور تحریک کے پورے

---

[۱] سب سے پہلا نام جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں مشہور ہوا "شیعہ" تھا کہ حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری، حضرت مقداد اور حضرت عمار بن یاسر اس نام سے مشہور ہوئے۔ (حاضر العالم الاسلامی جلد اوّل صفحہ ۱۸۸)

[۲] وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورہ الشعراء آیت ۲۱۴-۲۱۵)
ترجمہ: اے نبیؐ اپنے خاندان اور نزدیکی افراد کو (اپنی طرف اور خدا کے دین کی طرف بلاؤ) خدا سے ڈراؤ، اس وقت جو لوگ تم پر ایمان لے آئیں اور مسلمان ہو جائیں یعنی اپنے پیروکاروں پر اپنے پروں (بازوؤں) کا سایہ کرو اور ان کو اپنی حفاظت میں لے لے۔

[۳] اس حدیث کے ضمن میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (دعوت اسلام کے وقت) میں سب سے چھوٹا تھا۔ میں نے عرض کی کہ میں آپؐ کا وزیر بنتا ہوں۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے دستِ مبارک میری گردن میں ڈال دیئے اور فرمایا کہ یہ شخص میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے، اس کی اطاعت کرو۔ لوگ ہنستے تھے اور مذاق کرتے تھے اور ساتھ ہی ابوطالبؑ سے کہتے تھے: تجھے حکم دیا گیا ہے کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔ (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۶۳۔ تاریخ ابوالفداء جلد اوّل صفحہ ۱۱۶۔ البدایہ والنہایہ جلد سوم صفحہ ۳۹۔ غایۃ المرام صفحہ ۳۲۰)

عرصے میں اس کو وزارت اور جانشینی کے فرائض سے معزول رکھے اور اسکی جانشینی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھے۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ نے کئی مستفیض اور متواتر احادیث و روایات کے ذریعے جو شیعہ اور سنّی دونوں ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں واضح طور پر فرمایا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام[1] اپنے قول و فعل میں خطا اور گناہ سے پاک ہیں، وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں یا جو کام بھی انجام دیتے ہیں وہ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور وہ اسلامی معارف کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے ہیں۔[2]

۳۔ حضرت علی علیہ السلام نے بہت ہی گرانبہا خدمات انجام دیں اور بے اندازہ فداکاریاں کیں مثلاً ہجرت کی رات حضرت پیغمبر اکرمؐ کے بستر مبارک پر سوئے[3] اور وہ فتوحات جو انہوں نے جنگ بدر، جنگ احد، جنگِ خندق اور جنگ خیبر میں حاصل کی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک معرکے میں بھی علیؑ موجود نہ ہوتے تو دشمنانِ حق کے ہاتھوں اسلام اور اہلِ اسلام کی بیخ کنی ہو جاتی۔[4]

۴۔ غدیر خم کا واقعہ جس میں پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ کو اپنے جانشین کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور ان کو اپنا وصی بنایا۔[5]

---

[2] پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: حکمت (دانائی کے دس حصّے ہیں جن میں سے نو حصے حضرت علیؑ کو ملے ہیں اور ایک حصہ پوری دنیا کے لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ہفتم صفحہ ۳۵۹)

[3] جس وقت کفارِ مکّہ نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات پیغمبر اکرمؐ کو قتل کر دیں گے تو آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیا تھا اور پیغمبر اکرمؐ نے فیصلہ کیا کہ آپؐ ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں تو علیؑ سے فرمایا: "کیا تم آج رات میرے بستر پر سونے کے تیار ہو تاکہ دشمن یہ خیال کریں کہ میں سویا ہوا ہوں اور وہ میرا پیچھا نہ کریں تو حضرت علیؑ نے اس خطرناک صورتحال میں آپؐ کے فرمان کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

[4] مختلف تواریخ اور جامع کتب احادیث۔

[5] حدیث غدیر خم شیعہ اور اہلسنت کے درمیان مسلّمہ احادیث میں سے ہے اور ایک سو سے زیادہ اصحاب نے اسناد اور مختلف عبارات کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے اور عام و خاص کتابوں میں لکھی ہوئی ہے تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب غایت المرام صفحہ ۷۹ اور طبقات جلد غدیر والغدیر۔

[1] ام سلمہ سے روایت ہے، پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "علیؑ ہمیشہ حق اور قرآن کے ساتھ اور حق و قرآن ہمیشہ علیؑ کے ساتھ ہیں اور قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے" یہ حدیث ۱۵ مرتبہ عام طریقے سے اور ۱۱ مرتبہ خاص طریقے سے نقل ہوئی اور اس کے راوی ام سلمہ، ابن عباس، ابوبکر، عائشہ، علی، ابوسعید خدری، ابویعلیٰ اور ابو ایوب انصاری ہیں۔ (غایت المرام بحرانی صفحہ ۵۳۹--۵۴۰)

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: خدا علیؑ پر رحمت کرے حق ہمیشہ اس کے ساتھ ہے (البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۳۷)

ظاہر ہے کہ ایسے خصوصی امتیازات اور فضائل جو سب افراد کے لئے قابلِ قبول[1] تھے اور حضرت علیؑ کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی بے اندازہ محبت[2] نے فطری طور پر رسول خداؐ کے اصحاب میں سے ایک بڑی تعداد کو ان کی فضیلت اور حقیقت کا شیفتہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضرت علیؑ کو پسند کیا اور ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان کی پیروی اور اطاعت شروع کر دی یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس پسندیدگی کی وجہ سے آپ سے حسد کرنا شروع کر دیا اور آپ کے دشمن بن گئے۔

ان سب کے علاوہ شیعۂ علیؑ اور شیعۂ اہلبیتؑ کا نام پیغمبر اکرمؐ کی احادیث میں بہت زیادہ نظر آتا ہے۔[3]

اقلیّت شیعہ کے اکثریت سنّی سے جدا ہونے کی وجہ اور اختلافات کا پیدا ہونا

رسول پاکؐ، صحابہ کرام اور تمام مسلمانوں کی نظر میں حضرت علیؑ کی قدر و منزلت کے باعث آپ کے پیروکاروں کو یقین تھا کہ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد خلافت اور رہبری حضرت علیؑ کا مسلمہ حق ہے۔ اسکے علاوہ تمام شواہد و حالات بھی اس عقیدے کی تصدیق کرتے تھے، سوائے ان کے جو پیغمبر اکرمؐ کی بیماری کے زمانے میں رونما ہوئے۔[4]

---

[1] تاریخ یعقوبی طبع نجف جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ و ۱۴۰۔ تاریخ ابو الفداء جلد اوّل صفحہ ۱۵۶۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۰۷۔ مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۴۳۷۔ تاریخ ابی الحدید جلد اوّل صفحہ ۱۲۷، ۱۶۱۔

[2] صحیح مسلم جلد ۱۵ صفحہ ۱۷۶۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۲۰۷۔ مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۴۳۷، ۴۳۷۔ تاریخ ابو الفدا جلد اول صفحہ ۱۲۷۔۱۸۱۔

[3] حضرت جابر کہتے ہیں: ایک دن پیغمبر اکرمؐ کے پاس بیٹھا تھا کہ دور سے علیؑ دکھائی دیئے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ شخص، اس کے پیروکار اور دوست قیامت کے دن بخشے جائیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ جب آیۂ کریمہ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ (سورہ البینۃ آیت ۷) نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ یہ آیت تم پر اور تمہارے شیعوں پر صادق آتی ہے کہ قیامت کے دن خوش اور راضی ہوں گے اور خدا بھی تم پر راضی ہوگا۔ یہ دو حدیثیں اور ایسی ہی دوسری کئی حدیثیں کتاب درِ منثور جلد اوّل صفحہ ۲۷۹۔ اور غایت المرام صفحہ ۳۲۶ پر موجود ہیں۔

[4] آنحضرتؐ نے مرض الموت کی حالت میں اسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا اور تاکید کی کہ سب لوگ اس جنگ میں شرکت کریں اور مدینے سے باہر نکل جائیں۔ ایک جماعت نے آپؐ کے حکم کی خلاف ورزی کی اس میں ابوبکر اور عمر بھی تھے۔ اس واقعہ نے پیغمبر اکرمؐ کو بہت زیادہ صدمہ پہنچایا۔ (شرح ابن ابی الحدید طبع مصر جلد اوّل صفحہ ۵۳)

پیغمبر اکرمؐ نے رحلت کے وقت فرمایا کہ قلم اور دوات لاؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایک چٹھی لکھوں کہ تمہاری ہدایت اور راہنمائی کا باعث بنے اور تم گمراہ ہونے سے بچ جاؤ۔ حضرت عمر نے اس کام سے منع کر دیا اور کہا کہ آپؐ کا مرض بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور شدید بخار کی حالت میں آپؐ کو ہذیان ہے۔ (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۴۳۶۔ صحیح بخاری جلد ۳۔ صحیح مسلم جلد ۵۔ البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۲۷ تاریخ ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۱۳۳)

لیکن ان لوگوں کی توقعات کے بالکل برخلاف ٹھیک اس وقت جبکہ پیغمبر اکرمؐ نے رحلت فرمائی اور ابھی آپ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی اور اہلبیتؑ اور بعض اصحاب سوگواری اور کفن دفن کے انتظامات کر رہے تھے، خبر ملی کہ ایک جماعت نے جو بعد میں اکثریت کی حامل ہوئی، بہت ہی جلد بازی سے پیغمبر اکرمؐ کے اہل و عیال، رشتہ داروں اور پیروکاروں سے مشورہ کئے بغیر اور حتیٰ کہ ان کو اطلاع دیئے بغیر، ظاہری خیر خواہی اور مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر مسلمانوں کے لئے خلیفہ کا انتخاب کر لیا اور اس کی خبر حضرت علیؑ اور آپ کے پیروکاروں کو کام انجام پا جانے کے بعد دی گئی تھی۔[1] حضرت رسول اکرمؐ کے کفن و دفن کے بعد جب حضرت علیؑ اور آپ کے پیروکاروں عباس، زبیر، سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انہوں نے انتخابی خلافت اور خلیفہ کو انتخاب کرنے والوں پر سخت اعتراضات کئے اور اسی ضمن میں (احتجاجی) جلسے بھی ہوئے مگر جواب دیا گیا کہ مسلمانوں کی اسی میں بہتری تھی۔[1]

یہی اعتراض تھا جس نے اقلیت کو اکثریت سے جدا کر دیا تھا اور حضرت علیؑ کے پیروکاروں کو معاشرے میں "شیعۂ علیؑ" کے نام سے پہچنوایا تھا۔ البتہ حکومت اور خلافت کے مامور بھی سیاسی لحاظ سے کڑی نظر رکھے ہوئے تھے کہ مذکورہ اقلیت اس نام سے مشہور نہ ہو اور اسلامی معاشرہ اکثریتی اور اقلیتی گروہوں میں تقسیم نہ ہونے پائے بلکہ وہ خلافت کو "اجماع امت" جانتے تھے اور اعتراض کرنے والوں کو بیعت اور مسلمانوں کے مخالفوں کے طور پر تعارف کراتے تھے اور کبھی دوسرے برے ناموں سے بھی یاد کیا کرتے تھے۔[2]

یہی واقعہ خلیفۂ اوّل (حضرت ابوبکر) کی مرض موت کے وقت تکرار ہوا تھا کہ خلیفۂ اوّل نے حضرت عمر کی خلافت کے لئے وصیت کی تھی اور وصیت کرتے وقت بیہوش ہو گئے تھے، مگر حضرت عمر نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور اس کو خلیفۂ اوّل کا ہذیان نہیں کہا تھا، حالانکہ خلیفۂ وقت وصیت لکھتے ہوئے بیہوش ہو گئے تھے لیکن پیغمبر اکرمؐ تو معصوم تھے اور آپؐ کا فرمانا بھی بجا تھا۔ (روضۃ الصفا جلد ۲ صفحہ ۲۶۰)

[1] شرح ابن ابی الحدید جلد اوّل صفحہ ۵۸ اور صفحہ ۱۲۳ تا ۱۳۵۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۰۲۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۴۴۵ تا ۴۶۰

[2] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۰۳-۱۰۶، تاریخ ابی الفداء جلد اوّل صفحہ ۱۵۶ اور ۱۶۶، مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۰۷ و ۳۵۲ تاریخ ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۱۷ و ۱۳۴۔

[3] عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے کہا: آیا کسی نے حضرت ابوبکر کی بیعت کرنے کی مخالفت کی ہے، تو اس نے جواب دیا: کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے ان لوگوں کے جو مرتد ہو گئے ہیں یا مرتد ہو رہے ہیں۔ (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۴۴۷)

البتہ شیعہ لوگ شروع سے ہی وقتی سیاست کے محکوم ہو گئے تھے لیکن صرف اعتراضات کے ذریعے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ ادھر حضرت علیؑ بھی مسلمانوں اور اسلام کی خاطر اور کافی طاقت وقوت نہ رکھنے کی وجہ سے ایک خونی انقلاب برپا نہ کر سکے، لیکن اعتراض کرنے والے لوگ اپنے عقیدے اور نظریئے کے لحاظ سے اکثریت کے تابع نہ ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی اور علمی رہبری کو حضرت علیؑ کا حق جانتے تھے[1] اور علمی و معنوی مرکز صرف علیؑ کو ہی سمجھتے تھے اور اسی طرح دوسروں کو حضرت علیؑ کی طرف دعوت دیتے تھے۔[2]

جانشینی اور علمی رہبری کے دو مسائل

اسلامی تعلیمات کے مطابق شیعوں نے جو کچھ سیکھا تھا اس پر معتقد تھے۔ جو چیز معاشرے کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور دینی ثقافت کو واضح کیا جائے[3] اور دوسرے درجے پر ان کو معاشرے میں مکمل طور پر نافذ اور جاری کرنا ہے۔

دوسرے الفاظ میں معاشرے کے افراد دنیا اور انسانوں کو حقیقت بین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے انسانی فرائض کو پورا کریں (جیسا کہ انسانوں کی حقیقی مصلحت ہے) اور ان کو سمجھیں اور ان

---

[1] مشہور حدیث ثقلین میں آیا ہے: "میں تمہارے درمیان دو بہت ہی اہم چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ دو چیزیں "قرآن مجید" اور "اہلبیتؑ" ہیں جو قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ یہ حدیث ایک سو سے زیادہ بار اور تقریباً ۳۵ اصحاب پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔
(طبقات، جلد حدیث ثقلین۔ غایۃ المرام صفحہ ۲۱۱)
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ، پس جو شخص علم کا طالب ہے اس دروازے سے داخل ہو جائے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷، صفحہ ۳۵۹)

[2] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۰۵ و ۱۵۰ میں بار بار اس کا ذکر ہوا ہے۔

[3] کتاب خدا، پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور آئمہ اہلبیتؑ کے بیانات سے علم حاصل کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔
(بحار الانوار جلد ۱ صفحہ ۵۵)

پر عمل کریں، اگرچہ وہ فرائض ان کی اپنی مرضی اور خواہش کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ ایک دینی حکومت، حقیقی اسلامی انتظام اور نظم و نسق کو معاشرے میں مضبوط اور محفوظ رکھے اور اسے نافذ کرے اس طرح کہ لوگ خدا کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں اور وہ مکمل آزادی سے انفرادی اور اجتماعی انصاف سے بہرہ ور ہوں۔ یہ دونوں کام اس شخص کے ہاتھوں انجام پائیں جس کی عصمت اور حفاظت خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہو، ورنہ ممکن ہے ایسے اشخاص اقتدار حکومت اور علمی رہبری کو اپنے ہاتھ میں لے لیں جو اپنے فرائض کی ذمہ داری میں فکری انحراف یا خیانت سے محفوظ نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی آزادی بخش عادلانہ حکومت اور ولایت آہستہ آہستہ استبدادی سلطنت اور قیصر و کسریٰ جیسی حکومت میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔ پاک دینی علوم اور دوسرے مذاہب کے معارف میں تبدیلیاں پیدا ہو جائیں اور بوالہوس و خود غرض دانشور یا افراد ان میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کر دیں اور صرف وہ شخص جس کی تصدیق پیغمبر اکرمؐ نے کی ہو اور وہ شخص اپنے قول و فعل میں پاک اور پختہ ہو اور اس کے طور طریقے کتابِ خدا اور سنّتِ رسولؐ کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتے ہوں اور ایسے شخص صرف حضرت علیؑ تھے۔[1]

اگرچہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قریش حضرت علیؑ کی خلافتِ حقہ کے مخالف تھے، تو اس صورت میں ضروری تھا کہ مخالفوں کو حق کی اطاعت پر مجبور کیا جاتا اور سرکش لوگوں کو سر اٹھانے کی اجازت نہ دی جاتی، نہ کہ قریش کی مخالفت کے ڈر سے حق کو پامال کیا جاتا، جیسا کہ خلیفۂ اوّل نے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی تھی جنہوں نے زکوٰۃ دینا بند کر دی تھی، لیکن زکوٰۃ لینے سے چشم پوشی نہ کی گئی۔

جس چیز نے شیعوں کو انتخابی خلافت کے قبول اور تسلیم نہ کرنے پر ابھارا وہ یہ تھی کہ ان کو بعد میں رونما ہونے والے ناگوار اتفاقات و حوادث کا خوف تھا یعنی اسلامی حکومت کے نظام اور طریقوں میں بدعنوانی اور فساد کے پیش خیمے کے نتیجے میں دین مبین اسلام کی بنیادی تعلیمات کی خرابی لازمی نظر آتی تھی۔ اتفاق سے بعد میں رونما ہونے والے حوادث بھی اس عقیدے یا پیشینگوئی کو تقویت دے رہے تھے جس کے نتیجے میں شیعہ جماعت اپنے عقیدے پر زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی یا یوں کہئے کہ ظاہری طور پر ایک چھوٹی سی

---

[1] البدایہ والنہایہ، جلد ۷، صفحہ ۳۶۰۔

جماعت ایک بڑی اکثریت کو اپنے اندر ضم کرنے چلی تھی لیکن باطنی طور پر اہلبیتؑ سے اسلامی تعلیمات حاصل کرنے اور اپنے طریقے کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہی تھی اور اپنے عقائد پر مُصر تھی، مگر اس کے ساتھ ہی اسلامی طاقت کی ترقی اور حفاظت کے پیشِ نظر (حکومت کے ساتھ) اعلانیہ مخالفت بھی نہیں کرتی تھی، حتیٰ کہ شیعہ اکثریت کے دوش بدوش جہاد پر جاتے اور رفاہ عامہ کے کاموں میں حصہ لیتے تھے اور خود حضرت علیؑ اسلام کے فائدے کی خاطر لوگوں کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔[1]

انتخابی خلافت کا سیاسی طریقہ اور شیعہ عقیدے کے ساتھ اختلاف

شیعہ جماعت کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی آسمانی اور خدائی شریعت جس کا سارا مواد خدا کی کتاب اور پیغمبر اکرمؐ کی سنّت میں واضح کیا جا چکا ہے، قیامت تک اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے اور ہرگز قابلِ تغیر نہیں ہے۔[2] لہٰذا اسلامی حکومت کے پاس اس قانونِ شریعت کو مکمل طور پر نافذ نہ کرنے کے لئے کوئی عذر یا بہانہ نہیں ہے کہ اس شریعت کی خلاف ورزی کرے۔ اسلامی حکومت کا اوّلین فرض یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی کی حدود میں مشورے اور مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر فیصلے کرے اور قدم اٹھائے، لیکن شیعوں کی سیاسی و مصلحتی بیعت اور اسی طرح "کاغذ، قلم اور دوات" کا واقعہ جو پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا تھا، ان سے ظاہر تھا کہ انتخابی خلافت کے طرفداروں اور اس کے چلانے والوں کا اعتقاد ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن مجید) بنیادی قانون کی طرح محفوظ

---

[1] تاریخ یعقوبی صفحہ ۱۱۱، ۱۲۶ اور صفحہ ۱۲۹۔

[2] اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ○ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سورہ حم سجدہ آیت ۴۲) ترجمہ: قرآن کریم ایسی محترم کتاب ہے جو ہرگز پہلے یا بعد باطل اور (کسی زمانے میں) منسوخ نہیں ہوگی اور باطل کسی طرح بھی اس میں داخل نہیں ہوگا۔ اور پھر فرماتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (سورہ یوسف آیت ۴۰ و ۶۷) خدا کے سوا کسی کو حکم نہیں کرنا چاہئے، یعنی شریعت صرف خدا کا قانون ہے جو نبوت کے ذریعے لوگوں تک پہنچتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورہ احزاب آیت ۴۰) اس آیت کے ذریعے ختم نبوت اور ختم شریعت کو پیغمبر اسلامؐ کے لئے بیان فرمایا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورہ مائدہ آیت ۴۴) ترجمہ: جو شخص خدا کے حکم کے مطابق حکم اور فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔

رہے لیکن پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور سنّت کو اپنی جگہ پر ثابت نہیں سمجھتے بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اسلامی حکومت، زمانے کی ضروریات اور مصلحتِ وقت کے سبب ان کے نفاذ کو نظر انداز کر سکتی ہے اور یہ عقیدہ ان بہت زیادہ احادیث و روایات کے ذریعے جو بعد میں نقل ہوئیں، صحابہ کے حق میں ثابت ہو گیا تھا کہ وہ مجتہد ہیں اور اگر اجتہاد یا مصلحت اندیشی میں اختلاف کریں تو مجبور ہیں اور خطا کریں تو معذور، اس کا اہم ترین نمونہ وہ ہے جبکہ خلیفہ کا جرنیل خالد بن ولید رات کے وقت ایک مشہور مسلمان (مالک بن نویرہ) کے گھر مہمان ہوا اور پھر موقع پا کر اس کو قتل کر دیا، اس کا سر کاٹ کر بھٹی میں جلا دیا اور پھر اسی رات مالک بن نویرہ کی بیوی کے ساتھ اس نے زنا کیا۔ اس شرمناک واقعے کے بعد چونکہ خلیفۂ وقت کو ایسے جرنیل کی ضرورت تھی لہٰذا شریعت کی حد کو خالد بن ولید کے حق میں جاری نہ کیا گیا تھا۔[1] اور اسی طرح اہلبیتؑ کو خمس کا حصہ نہ دیا گیا۔[2] اور پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کا لکھنا بالکل ممنوع کر دیا گیا، اگر کوئی حدیث کسی جگہ لکھی ہوئی نظر آتی یا کسی سے ملتی تو اس کو فوراً ضبط کر کے جلا دیا جاتا،[3] اور یہ ممنوعیت تمام خلفائے راشدین کے زمانے سے لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ (۹۹ تا ۱۰۲ ہجری) کے عہد تک جاری رہی[4] اور خلیفہ دوم کے زمانے میں یہ سیاست واضح تر ہو گئی تھی۔ خلیفۂ وقت نے بعض شرعی احکام مثلاً حج تمتع، نکاح

---

[1] تاریخ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۱۱۰۔ تاریخ ابی الفداء جلد اوّل، صفحہ ۱۵۸۔

[2] در المنثور، جلد ۳، صفحہ ۱۸۶، تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۴۸۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں خمس کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ (سورہ انفال آیت ۴۱)

[3] حضرت ابوبکر نے اپنے عہد خلافت میں پانچ سو احادیث جمع کی تھیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات صبح تک میں نے اپنے باپ کو بہت سخت پریشان دیکھا۔ صبح کے وقت اس نے مجھے کہا کہ ساری حدیثوں کو میرے پاس لاؤ، پھر سب کو جلا دیا۔ (کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۲۳۷) حضرت عمر نے تمام شہروں میں پیغامات بھجوائے کہ جس شخص کے پاس کوئی لکھی ہوئی حدیث موجود ہو تو اسے نابود کر دے (کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۲۳۷) محمد بن ابی بکر کہتے ہیں: حضرت عمر کے زمانے میں بہت زیادہ احادیث جمع ہو گئی تھیں، جب لوگ ان احادیث کو آپ کے پاس لائے تو آپ کے حکم سے سب کو جلا دیا گیا (طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۱۴۰)

[4] تاریخ ابی الفدا جلد اول صفحہ ۱۵۱ وغیرہ۔

متعہ اور اذان میں حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل کہنا ممنوع قرار دیدیا۔[1] میں طلاق دینے کی رسم نافذ کی گئی اور ایسے ہی کئی دوسرے احکام وغیرہ۔[2] ان کی خلافت کے دوران بیت المال کا حصہ عوام کے درمیان فرق اور اختلاف سے تقسیم ہوا[3] جس کے نتیجے میں عجیب طبقاتی اختلاف اور خطرناک خونی مناظر سامنے آئے۔ ان کے زمانے میں امیر معاویہ ملک شام میں قیصر و کسریٰ جیسے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور رسم و رواج کے ساتھ حکومت کرتا تھا اور یہاں تک کہ خلیفۂ وقت بھی اسے کسریٰ عرب (عرب کا بادشاہ) کہہ کر خطاب کیا کرتا تھا اور کبھی اس کے اس حاں پر اعتراض نہ کیا۔

خلیفہ دوم ۲۳ ہجری میں ایک ایرانی غلام کے ہاتھوں قتل ہوئے اور چھ رکنی کمیٹی کی اکثریت رائے سے جو خلیفہ دوم کے حکم سے منعقد ہوئی تھی۔ خلیفہ سوم نے زمام امور سنبھالی، انہوں نے اپنے عہدِ خلافت میں اپنے اموی خویش و اقارب کو لوگوں پر مسلط کر دیا تھا اور اس طرح حجاز و عراق، مصر اور تمام اسلامی ممالک میں عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں سونپ دی،[4] انہوں نے لاقانونیت کی بنیاد رکھی اور آشکارا طور پر ظلم و ستم اور فسق و فجور کی خلاف ورزی اسلامی حکومت میں شروع ہوگئی۔ دارالخلافہ میں ہر طرف سے شکایتوں کے طومار آنے لگے، لیکن خلیفہ اپنی اموی کنیزوں اور لونڈیوں اور خاص کر مروان[5] بن الحکم کے زیر اثر ان شکووں اور شکایتوں پر توجہ ہی نہ کرتے

---

[1] پیغمبر اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر مکہ کے اردگرد یا دور دراز سے آنے والے حاجیوں کے لئے عمل حج کو (آیہ کریمہ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ ..... الخ - سورۃ البقر آیت ۱۹۶ کے مطابق) خاص شکل میں انجام دینے کے لئے معین کر دیا تھا اور حضرت عمر نے اپنی خلافت کے دوران اسے ممنوع قرار دیدیا تھا اور اسی طرح رسولخداؐ کے زمانے میں متعہ (وقتی نکاح) جاری تھا لیکن حضرت عمر نے اپنے عہدِ خلافت میں اس کو ممنوع کر دیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزا مقرر کر دی تھی کہ ایسے لوگوں کو سنگسار کر دیا جائے اور اسی طرح رسول اکرمؐ کے زمانے میں اذان میں حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل (یعنی بہترین عمل کے لئے تیار ہو جاؤ جو نماز ہے) کہا جاتا تھا لیکن حضرت عمر نے کہا کہ یہ فقرہ مسلمانوں کو جہاد سے روکتا ہے اس لئے ممنوع کر دیا۔ اور ایسے ہی پیغمبر خداؐ کے زمانے میں طلاق صرف ایک بار سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی لیکن خلیفہ دوم نے حکم دیا کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں۔ یہ تمام واقعات شیعہ اور اہلسنت کی کتب فقہ میں موجود اور معروف ہیں۔

[2] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۳۱۔ تاریخ ابی الفدا جلد اول صفحہ ۱۶۰۔

[3] اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۳۸۶۔ الاصابہ جلد ۳۔

[4] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۰۔ تاریخ ابی الفدا جلد اول صفحہ ۱۶۸۔ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۳۷۷ وغیرہ۔

[5] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۰، تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۳۹۷۔

اور اس طرح ظلم و ستم کا انسداد کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی بلکہ کبھی کبھی حکم دیتے کہ شکایت کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جائے[1]، اور آخر کار ۳۵ ہجری میں لوگوں نے ان کے خلاف مظاہرے کئے اور چند روز تک ان کے مکان کو گھیرے رکھا اور پھر مار دھاڑ کے بعد ان کو قتل کر دیا گیا۔ خلیفہ سوم نے اپنے دورانِ خلافت میں شام کی حکومت معاویہ کو دے رکھی تھی جو ان کے اموی خویش و اقارب میں بہت ہی اہم شخص تھا۔ وہ معاویہ کو زیادہ سے زیادہ مدد دیتے اور اس کو مضبوط کیا کرتے تھے۔ دراصل شام خلافت کا اصلی مرکز بن چکا تھا اور دارالخلافہ مدینہ میں صرف نام کی حکومت باقی رہ گئی تھی[2]، خلیفۂ اوّل کی خلافت اکثریت صحابہ کی رائے اور انتخاب سے

---

[1] مصر کی ایک جماعت نے خلیفہ کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ حضرت عثمان کو خطرہ لاحق ہو گیا، انہوں نے حضرت علی ابن ابیطالبؑ سے مدد کی درخواست کی اور اپنے کئے پر نادم ہوئے۔ حضرت علیؑ نے مصریوں سے فرمایا: تم حق کو زندہ کرنے کے لئے اٹھے ہو اور عثمان نے توبہ کر لی ہے اور کہتا ہے، میں گزشتہ روش چھوڑ دیتا ہوں اور تین دن کے اندر اندر تمہارے مطالبے پورے کر دوں گا اور ظالم حکمرانوں کو معزول کر دوں گا۔ پس حضرت علیؑ نے حضرت عثمان کی طرف سے مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ معاہدے پر دستخط کر دیئے اور وہ واپس چلے گئے۔

راستے میں انہوں نے حضرت عثمان کے غلام کو دیکھا جو عثمان کے اونٹ پر سوار مصر جا رہا تھا، لوگوں نے اس پر شک کیا اور پکڑ کر اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک خط نکلا جو حاکم مصر کے نام لکھا گیا تھا اور اس خط کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — جب عبدالرحمٰن بن عدیس تمہارے پاس پہنچے تو اس کو ایک سو کوڑے لگاؤ، اس کا سر اور اس کی داڑھی مونڈ کر جیل میں ڈال دو اور اسے لمبی قید کی سزا دو اور یہی عمل عمر بن الحمق، سودان بن حمران اور عروہ بن نباع کے بارے میں انجام دو۔"

ایلچی سے خط لے لیا گیا اور مصری لوگ نہایت غصے کی حالت میں عثمان کی طرف واپس لوٹے اور کہنے لگے: تم نے ہم سے خیانت اور غداری کی ہے، عثمان نے خط سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا، تمہارا غلام یہ خط لے کر جا رہا تھا۔ جواب ملا کہ وہ میری اجازت کے بغیر اس عمل کا مرتکب ہوا ہے۔ انہوں نے کہا، جس اونٹ پر وہ سوار تھا وہ تمہارا تھا۔ جواب دیا کہ اس نے میرے اونٹ کو چرایا ہے۔ انہوں نے کہا، یہ خط تمہارے منشی نے لکھا ہے۔ عثمان نے جواب دیا، اس نے میری اطلاع کے بغیر یہ کام کیا۔ اس پر وہ کہنے لگے۔ بہرحال تم خلافت کے لائق نہیں ہو، بہتر ہے کہ مستعفی ہو جاؤ، کیونکہ اگر یہ کام تمہاری اجازت سے ہوا تو تم غدار ہو۔ اور اگر ایسا اہم کام تمہاری اطلاع کے بغیر ہوا ہے تو اس سے تمہاری بے لیاقتی اور کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اب یا استعفےٰ دو یا ابھی اپنے ظالم حاکموں کو معزول کرو۔ عثمان نے جواب میں کہا: اگر میں تمہاری مرضی سے کام کروں تو پھر حکومت تمہاری ہے، میں کون ہوں؟ وہ لوگ غصے میں مجلس سے اٹھ گئے۔

(تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۴۰۲-۴۰۹ - تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۱-۱۵۰)

[2] تاریخ طبری جلد ۳، صفحہ ۳۷۷۔

معیّن ہوئی تھی اور خلیفۂ دوم، خلیفۂ اوّل کی وصیّت سے منتخب ہوئے اور خلیفۂ سوم چھ رکنی مشاورتی کمیٹی کی رائے کے ساتھ انتخاب کئے گئے تھے اور اس کمیٹی کا دستور العمل اور منشور بھی خود خلیفۂ دوم نے بنایا تھا، مجموعی طور پر تین خلفاء کا انتظام مملکت داری، جنہوں نے ۲۵ سال حکومت کی تھی یوں تھا کہ اسلامی قوانین، اجتہاد اور مصلحتِ وقت کے مطابق معاشرے میں نافذ کئے جائیں اور اس مصلحت بینی کو خود خلیفۂ وقت تشخیص دے۔

(اس زمانے میں) اسلامی علوم و معارف کا طریقہ یہ تھا کہ صرف قرآن کو کسی تفسیر اور غور و خوض اور معانی کو سمجھے بغیر پڑھا جائے اور پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کو لکھے بغیر ہی بیان کیا جائے اور سننے یا بتانے سے تجاوز نہ کیا جائے۔ قرآن کریم کی کتابت پر بھی اجارہ داری تھی۔ حدیث کی کتابت ممنوع[1] تھی۔ جنگِ یمامہ جو ۱۲ ہجری میں ختم ہوئی تھی اور اس جنگ میں صحابہ اور قرآن کے قاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی تھی اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب نے خلیفۂ اوّل کو تجویز پیش کی کہ قرآنی آیات کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کر دیں کیونکہ خدانخواستہ اگر ایسی ہی ایک اور جنگ رونما ہوگئی اور باقیماندہ قاری بھی شہید ہوگئے تو قرآن مجید ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا (محو ہو جائے گا) لہٰذا ضروری ہے کہ قرآنی آیات کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کر کے اس کی کتابت کی جائے۔[2] قرآنِ مجید کے بارے میں تو یہ فیصلہ کر دیا گیا مگر احادیثِ رسول اکرمؐ جو قرآن مجید کے بعد دوسرے درجے پر مقام رکھتی ہیں اور احادیث کو بھی وہی خطرہ درپیش تھا معانی اور لکھائی میں کمی بیشی، جعل، فراموشی اور دستبرد سے محفوظ نہیں تھیں، لیکن احادیث شریف کی حفاظت کے لئے کوئی کوشش نہ کی گئی بلکہ احادیث کی کتابت اور لکھائی کو ممنوع قرار دیدیا گیا اور جب بھی کوئی لکھی ہوئی حدیث ہاتھ لگتی تو اس کو جلا دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اسلامی احکام و ضروریات مثلاً نماز کے بارے میں بھی متضاد اور متعدد احادیث و روایات پیدا ہوگئیں، اسی طرح دوسرے تمام علمی موضوعات کے متعلق بھی کوئی خاطر خواہ اقدام نہ کیا گیا۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں علوم حاصل کرنے کے بارے میں جو احترام اور

---

[1] صحیح بخاری، جلد ۶، صفحہ ۹۸ - تاریخ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۱۱۳۔

[2] تاریخ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۱۱۱ - تاریخ طبری، جلد ۳، صفحہ ۱۲۹-۱۳۲۔

تاکید موجود ہے اور علوم کو وسعت و ترقی دینے پر جس قدر زور دیا گیا ہے وہ سب کا سب بے اثر ہو کر رہ گیا۔ اکثر لوگ اسلامی فوجوں کی۔ پے در پے فتوحات میں سرگرم اور بے اندازہ مال غنیمت سے راضی اور خوش تھے جو ہر طرف سے جزیرۃ العرب میں آرہا تھا، لہٰذا اب خاندانِ رسالت مآبؐ کے علوم کی طرف کوئی توجہ نہ تھی جس کے بانی علیؑ تھے اور پیغمبر اکرمؐ نے ان کو سب سے زیادہ عالم اور قرآن و اسلام کا شناسا کہہ کر لوگوں کو تعارف کرایا تھا۔ حتیٰ کہ قرآن شریف کو جمع کرنے کے واقعے میں (باوجودیکہ جانتے تھے کہ آپ نے رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد ایک مدّت تک کنجِ عزلت میں بیٹھ کر قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کر دیا تھا) بھی آپ کو شامل نہ کیا گیا، حتیٰ کہ آپ کا نام تک نہ لیا گیا،[1] یہ اور ایسے ہی دوسرے امور تھے کہ حضرت علیؑ کے پیروکاروں کو اپنے عقیدے میں زیادہ سے زیادہ راسخ اور مضبوط کر رہے تھے اور ان کو واقعات کے بارے میں زیادہ ہوشیار بنا رہے تھے۔ اس طرح روز بروز اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ ادھر حضرت علیؑ بھی جو تمام لوگوں کی تربیّت کرنے سے قاصر تھے صرف خاص لوگوں کی تربیّت پر توجّہ دے رہے تھے۔

ان پچیس ۲۵ سالوں میں حضرت علیؑ کے چار خاص اصحاب اور دوستوں میں سے تین وفات پا گئے جو ہر حال میں آپ کی پیروی میں ثابت قدم رہے تھے یعنی سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور مقداد۔ لیکن اسی مدت میں اصحاب اور تابعین کی ایک خاصی بڑی جماعت حجاز، یمن، عراق اور دوسرے ممالک میں حضرت علیؑ کے پیروکاروں میں شامل ہو گئی تھی اور آخر کار خلیفہ سوم کے قتل کے بعد ہر طرف سے عوام نے آپ کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا تھا، یہاں تک کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو خلافت کے لئے انتخاب کر لیا۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۱۱۳، تاریخ ابن ابی الحدید جلد اوّل صفحہ ۹، بہت زیادہ احادیث و روایات میں آیا ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تو انہوں نے ایک آدمی حضرت علیؑ کے پاس بھی بھیجا اور آپ سے بیعت چاہی۔ حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ نماز پڑھنے کے سوا گھر سے باہر نہ نکلوں تاکہ قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کر دوں۔ یہ بھی آیا ہے کہ حضرت علیؑ نے قرآن مجید کو ایک جلد میں جمع کرنے کے بعد ایک اونٹ پر لاد کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا اور سب کو دکھایا تھا۔ اور تاریخ میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ جنگ یمامہ جس کے بعد قرآن مجید ایک مصحف میں جمع کر کے لکھا گیا تھا، حضرت ابوبکر کی خلافت کے دوسرے سال پیش آئی تھی۔ مذکورہ بالا مطالب احادیث اور تاریخ کی بیشتر کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، جن میں قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کرنے اور اس کی کتابت کے واقعے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کی خلافت اور آپ کا طریقہ کار

حضرت علیؑ کی خلافت ۳۵ ہجری قمری کے آخر میں شروع ہوئی اور تقریباً چار سال پانچ مہینے جاری رہی۔ حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے دوران پیغمبر اکرمؐ کا رویّہ رائج کیا اور خود بھی اسی طریقے پر کاربند[1] تھے۔ اسلام میں ان اکثر تبدیلیوں کو جو پہلے خلفائے راشدین کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں، اپنی اصلی حالت میں لے آئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ظالم اور نالائق حاکموں کو جو مدّت سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے معزول کر دیا۔[2] یعنی حقیقت میں آپ کی حکومت ایک انقلابی تحریک تھی، مگر آپ کے سامنے مشکلات و مسائل کا ایک ڈھیر موجود تھا۔

حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے پہلے دن تقریر کرتے ہوئے یوں خطاب کیا تھا:

"خبردار! آپ لوگ جن مشکلات و مصائب میں پیغمبر اکرمؐ کی بعثت کے موقع پر گرفتار تھے آج دوبارہ وہی مشکلات آپ کو درپیش ہیں اور انہی مشکلات نے پھر آپ کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے آپ کو ٹھیک کر لیں اور علم و فضیلت والے لوگوں کو سامنے آنا چاہئے جو پیچھے دھکیل دیئے گئے ہیں اور وہ لوگ جو ناجائز اور بے جا طور پر سامنے آگئے ہیں ان کو پیچھے ہٹا دینا چاہئے (آج حق و باطل کا مقابلہ ہے، جو شخص اہلیّت و صلاحیت رکھتا ہے اسے حق کی پیروی کرنی چاہئے) اگر آج ہر جگہ باطل کا زور ہے تو یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور اگر حق کم ہو چکا ہے تو کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کم تعداد بھی آگے آجاتی ہے اور کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ ترقی کی امید بھی موجود ہے، البتہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے وہ پھر دوبارہ واپس آجائے۔[3]

حضرت علیؑ نے اپنی انقلابی حکومت جاری رکھی اور جیسا کہ ہر انقلابی تحریک کا خاصہ ہے کہ مخالف عناصر جن کے مفادات خطرے میں پڑ جاتے ہیں وہ ہر طرف سے اس تحریک کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، بالکل ایسے ہی مخالفین نے خلیفہ سوم کے قصاص کے نام پر داخلی انتشار اور خونی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد دوم صفحہ ۱۵۴۔ [2] تاریخ یعقوبی جلد دوم صفحہ ۱۵۵، مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۶۔ [3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۔

اور تقریباً حضرت علیؑ کے تمام عہدِ خلافت کے دوران یہ سلسلہ جاری رہا۔ شیعوں کے مطابق ان جنگوں کے شروع کرنے والوں کے سامنے ذاتی فوائد اور مفادات کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا اور خلیفۂ سوم کا قصاص صرف ایک عوام فریب حربہ تھا اور اس میں حتیٰ کہ کسی قسم کی غلط فہمی بھی موجود نہ تھی۔[1]

---

[1] حضرت رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے حضرت علیؑ کی پیروی میں خلیفۂ اوّل کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا ان کی تعداد بہت کم تھی اور اس اقلیت میں بعض صحابہ کرام بھی تھے مثلاً حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری، حضرت مقداد اور حضرت عمار یاسر وغیرہ۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے آغاز میں بھی ایک چھوٹی سی جماعت نے آپ کی بیعت کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان انکار کرنے والوں اور مخالفین میں سے سعید بن عاص، ولید بن عتبہ، مروان بن حکم، عمرو بن عاص، بسر بن ارطاۃ، سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہ تھے۔

ان دونوں فریقوں کی زندگی کے مطالعے اور ان کے کارناموں میں غور و خوض کرنے یا ان داستانوں اور حکایتوں سے جو تاریخ میں ان کے بارے میں درج ہیں، ان کی دینی شخصیت اور مقاصد واضح ہو جاتے ہیں۔

پہلا فریق اور گروہ پیغمبر اکرمؐ کے خاص اور برگزیدہ اصحاب، زاہد، عابد، فداکار، جاں نثار اور اسلامی آزادی پسند افراد پر مشتمل تھا، اور یہ پیغمبر اکرمؐ کے سب سے زیادہ پسندیدہ لوگ تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ خدا چار آدمیوں کو بہت ہی عزیز رکھتا ہے اور مجھے بھی حکم دیا ہے کہ ان کو عزیز رکھوں۔ صحابہ کرام نے ان کا نام پوچھا تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا "علی" اور پھر ابوذر، سلمان اور مقداد کا نام لیا۔ (سنن ابن ماجہ جلد اول صفحہ ۶۶)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا: اگر عمار بن یاسر کے سامنے دو کام رکھے جائیں تو وہ لازمی طور پر ان دونوں میں سے حقیقی اور بہتر کام کو انتخاب کریں گے۔ (سنن ابن ماجہ جلد اول صفحہ ۶۶)

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا، ابوذر سے زیادہ سچا آدمی زمین و آسمان میں موجود نہیں ہے۔ (سنن ابن ماجہ جلد اول صفحہ ۶۸)

ان افراد سے ان کی زندگی میں ایک بھی ایسا کام سرزد نہیں ہوا جو خلاف شرع ہو، انہوں نے کسی کا خونِ ناحق نہیں کیا انہوں نے کسی شخص کے لئے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی، انہوں نے نہ کسی کا مال لوٹا نہ چرایا اور انہوں نے کبھی گمراہی اور بدعنوانی سے لوگوں کو گمراہ نہیں کیا۔

لیکن تاریخ دوسرے گروہ اور فریق کی تباہ کاریوں اور ظالمانہ اعمال سے بھری پڑی ہے اور انہوں نے جو ناحق خون کئے ہیں، مسلمانوں کے مال و اموال کو لوٹا ہے، جو شرمناک اعمال انجام دیئے ہیں وہ ان گنت اور بے شمار ہیں اور ان اعمال کی کسی طرح بھی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ سوائے اس کے کہ یوں کہا جائے (جیسا کہ ایک جماعت کہتی ہے) خدا ان سے راضی تھا اور وہ جو کچھ وہ کرتے تھے اپنے ہر عمل میں آزاد تھے اور اسلامی قوانین نے ان کو معاف کر دیا تھا اور یہ اسلامی قوانین جو قرآن مجید اور سنتِ پیغمبر اکرمؐ میں موجود ہیں صرف دوسروں کے لئے نازل ہوئے تھے نہ کہ ان کے لئے۔

پہلی جنگ کی وجہ جو جنگ جمل کے نام سے یاد کی جاتی ہے، طبقاتی امتیازات کے بارے میں مظاہرے تھے جو خلیفہ اوّل کے زمانے میں بیت المال کی تقسیم میں اختلاف اور فرق کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ حضرت علی نے خلیفہ بننے کے بعد بیت المال کو برابر اور مساوی طور پر لوگوں میں تقسیم کیا۔[۱] جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ کی سیرت اور روش بھی یہی تھی اس طریقے سے زبیر اور طلحہ بہت ہی برہم ہوئے تھے اور انہوں نے نافرمانی کی بنیاد ڈالی تھی اور خانۂ کعبہ کی زیارت کے بہانے مدینہ سے مکّے چلے گئے۔ انہوں نے حضرت عائشہ کو جو اس وقت مکّہ میں تھیں اور حضرت علیؑ کے ساتھ ان کے اختلافات موجود تھے، اپنے ساتھ ملالیا اور اس طرح خلیفہ سوم کے قصاص کے نام پر خونی تحریک اور جنگ کا آغاز کیا جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔[۲]

حالانکہ یہی طلحہ اور زبیر خلیفہ سوم کے مکان کے محاصرے اور قتل کے وقت مدینہ میں موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے خلیفہ کا ہرگز دفاع نہیں کیا تھا۔[۳] اور خلیفہ سوم کے قتل کے فوراً بعد یہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے اپنی اور مہاجرین کی طرف سے حضرت علی کی بیعت کی تھی۔[۴] اسی طرح حضرت عائشہ بھی خود ان لوگوں میں تھیں جنہوں نے خلیفہ سوم کے قتل پر لوگوں کو ابھارا تھا۔[۵] اور جونہی انہوں نے خلیفہ سوم کے قتل کی خبر سنی تھی تو ان کو گالیاں دی تھیں اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ بنیادی طور پر خلیفہ سوم کے قتل کا اصلی سبب وہ صحابہ تھے جنہوں نے مدینہ سے دوسرے شہروں میں خطوط لکھ کر لوگوں کو خلیفہ کے خلاف ابھارا تھا۔

دوسری جنگ کی وجہ جس کا نام **جنگِ صفین** تھا اور تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی، وہ خواہش اور آرزو تھی جو معاویہ اپنی خلافت کے لئے رکھتا تھا اور خلیفہ سوم کے قصاص کے عنوان سے اس نے اس جنگ کو شروع کیا تھا اور اس جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد ناحق ہلاک ہوگئے۔ البتہ اس جنگ میں معاویہ حملہ کرتا تھا نہ کہ دفاع کیونکہ قصاص ہرگز دفاع کی صورت میں نہیں ہوسکتا۔

اس جنگ کا عنوان اور سبب خلیفہ سوم کا قصاص تھا۔ حالانکہ خود خلیفہ سوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام اور شورش و بغاوت کے زمانے میں معاویہ سے مدد کی درخواست کی تھی اور اس نے بھی ایک جرار لشکر کے ساتھ

---

[۱] مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۹۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۲۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۶۰۔ تاریخ ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۱۸۰۔

[۲] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۔ تاریخ ابی الفداء جلد ۱ صفحہ ۱۷۲۔ مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۶۶۔ [۳] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔

[۴] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔ تاریخ ابی الفدا جلد ۱ صفحہ ۱۷۱۔ [۵] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔

مدینہ کی طرف حرکت کی تھی لیکن راستے میں جان بوجھ کر اس قدر دیر کی کہ ادھر خلیفہ کو قتل کر دیا گیا۔ پھر اس واقعہ کے بعد وہ راستے سے ہی شام کی طرف واپس لوٹ گیا اور وہاں جا کر خلیفہ کے قصاص کا دعویٰ شروع کر دیا تھا۔[1]

اور اسی طرح جب حضرت علیؑ شہید ہو گئے اور معاویہ نے خلافت پر قبضہ کر لیا تو اس وقت اس نے خلیفہ کے قصاص کو فراموش کر دیا تھا اور خلیفہ کے قاتلوں کو سزا نہیں دی تھی اور نہ ہی ان پر مقدمہ چلایا تھا۔

جنگِ صفین کے بعد نہروان شروع ہو گئی اور اس جنگ میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد جن میں بعض اصحابِ رسولؐ بھی تھے، معاویہ کی تحریص و ترغیب کی وجہ سے حضرت علیؑ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اسلامی ممالک میں ہنگامے اور آشوب برپا کر دیئے تھے لہٰذا جہاں کہیں حضرت علیؑ کے پیروکاروں یا جانبداروں کو دیکھتے فوراً ان کو قتل کر دیتے تھے، حتیٰ کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ کر بچوں کو نکال کر ان کا سر قلم کر دیتے تھے۔[2]

حضرت علیؑ نے اس آشوب کا بھی خاتمہ کر دیا تھا، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد کوفہ کی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ایک خارجی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

حضرت علیؑ کی پانچ سالہ خلافت کے دوران شیعوں نے جو استفادہ کیا

اگرچہ حضرت علیؑ اپنی چار سال اور نو مہینے کی خلافت کے دوران اسلامی حکومت کے درہم برہم حالات کو مکمل طور پر سنبھالا نہ دے سکے اور اس کو اپنی پہلی حالت میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکے، لیکن تین طرح سے ان کو کامیابی ہوئی :-

۱۔ انہوں نے اپنی منصفانہ سیرت کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ کی پرکشش اور ہر دلعزیز شخصیت کو عوام اور

---

[1] جب حضرت عثمان مظاہرین کے نرغے اور محاصرے میں تھے تو انہوں نے ایک خط لکھ کر معاویہ سے مدد کی درخواست کی تھی اور معاویہ بھی بارہ ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر لے کر فوراً مدینہ کی طرف چل پڑا لیکن ساتھ ہی اپنی فوج کو حکم دیا کہ شام کی ہی حدود میں ٹھہر جائے اور خود عثمان کے پاس آیا اور لشکر کی تیاری کے متعلق رپورٹ دی۔ عثمان نے کہا کہ تم نے جان بوجھ کر فوج کو وہاں ٹھہرایا ہے تاکہ میں قتل ہو جاؤں اور پھر میرے قصاص کا بہانہ بنا کر بغاوت کر دو۔ (تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۲۵۔ تاریخ طبری صفحہ ۴۰۲)

[2] مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۴۱۵۔

خاص طور پر جدید نسل کے سامنے پیش کیا اور معاویہ کی شاہانہ شان و شوکت کے مقابلے میں آپ ہمیشہ غریبوں اور فقیروں کی طرح اور بیکس و نادار افراد کی مانند زندگی گزارتے تھے اور ہرگز اپنے دوستوں، خویش و اقارب اور خاندان کے افراد کو دوسروں پر ترجیح نہیں دیتے تھے اور امیر کو غریب پر یا طاقتور کو کمزور فوقیت نہیں بخشتے تھے۔

۲۔ ان تمام طاقت فرسا اور طولانی مشکلات کے باوجود آپ نے معارف الٰہی اور علوم انسانی کے گرانبہا اور قیمتی ذخائر یادگار چھوڑے ہیں۔

حضرت علیؑ کے مخالفین کا دعویٰ ہے کہ آپ بڑے بہادر اور شجاع انسان تھے لیکن اچھے سیاستدان نہیں تھے کیونکہ اپنی خلافت کے اوائل میں مخالف عناصر کے ساتھ وقتی طور پر صلح کر کے ان کو راضی رکھ سکتے تھے اور اس طرح اپنی خلافت کو محکم اور مضبوط بنانے کے بعد ان کا قلع قمع کر سکتے تھے۔

لیکن انہوں نے اس نکتے کو نظر انداز اور فراموش کر دیا ہے کہ حضرت علیؑ کی خلافت ایک انقلابی تحریک تھی اور ایک انقلابی تحریک کو بے جا تعریف، چاپلوسی، ظاہرداری اور ریاکاری سے دور رہنا چاہئے۔ ایسی ہی حالت پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں بھی پیش آئی تھی کہ کفار و مشرکین نے کئی بار آنحضرتؐ کو تجویز پیش کی تھی کہ اگر آنحضرتؐ ان کے خداؤں کی مخالفت اور توہین نہ کریں یا ان کو برا بھلا نہ کہیں تو وہ بھی ان کی دعوت اور تحریک کی مخالفت نہیں کریں گے، لیکن پیغمبر اکرمؐ نے ان کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی حالانکہ ان سخت حالات میں ان کی تعریف کر کے یا ان کے ساتھ بنا کر رکھتے ہوئے اپنی حالت اور طاقت کو مضبوط بنا سکتے تھے اور پھر دشمنوں کی مخالفت کر کے ان کا قلع قمع بھی کر سکتے تھے۔ لیکن حقیقت میں ایک اسلامی اور انقلابی تحریک ہرگز یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ ایک حقیقت کو زندہ کرنے کے لئے دوسری حقیقت کو مٹا یا یا پامال کر دیا جائے اور ایک باطل کو دوسرے باطل کے ذریعے رفع کیا جائے اور قرآن میں بہت سی آیات اس بارے میں موجود ہیں۔[1]

---

[1] آیہ کریمہ وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ (سورہ ص آیہ ۶) اور آیہ کریمہ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (سورہ اسرا آیہ ۷۷) اور آیہ کریمہ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (سورہ قلم آیہ ۹) ان آیات کریمہ کی شانِ نزول کے بارے میں حدیثی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔

لیکن اس کے برعکس حضرت علیؑ کے مخالفین اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر کسی بھی جرم، غداری اور اسلامی قوانین کی واضح اور علانیہ (بغیر استثناء کے) خلاف ورزی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے اور ہر بدنامی کو اپنے صحابی اور مجتہد ہونے کے بہانے سے دھو ڈالتے تھے۔ لیکن حضرت علیؑ اسلامی قوانین پر سختی سے کاربند تھے۔

حضرت علیؑ سے متفرق عقلی، دینی اور اجتماعی علوم و فنون کے بارے میں گیارہ ہزار چھوٹے لیکن پر معنی فقرے موجود ہیں۔[1] انہوں نے اپنی تقریروں کے دوران اسلامی علوم و معارف[2] کو بہت ہی فصیح و بلیغ اور سلیس و رواں زبان میں بیان کیا ہے۔[3] انہوں نے عربی زبان کی گرامر بھی لکھی تھی اور اس طرح عربی زبان و ادبیات کی بنیاد ڈالی تھی۔ آپ اسلام میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے خدائی اور دینی فلسفے پر غور و خوض کیا تھا۔[4] آپ ہمیشہ آزاد استدلال اور منطقی دلائل کے ساتھ بات کیا کرتے تھے اور وہ مسائل جن پر دنیا کے فلاسفروں نے اس وقت تک توجہ نہ دی تھی، آپ نے ان کو پیش کیا اور اس بارے میں اس قدر توجہ اور انہماک مبذول فرماتے تھے کہ حتیٰ عین جنگ کے دوران[5] بھی آپ علمی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے۔

۳۔ آپ نے اسلامی، مذہبی اور دینی دانشوروں کی ایک بہت بڑی جماعت[6] کی تربیت کی تھی کہ ان افراد کے درمیان بہت ہی پارسا، زاہد اور اہلِ علم و معرفت لوگ مثلاً اویس قرنی، کمیل بن زیاد، میثم تمار

---

[1] کتاب الغرر والدرر آمدی و متفرقات جوامع الحدیث۔ [2] مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۴۳۱۔ تاریخ ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۱۸۱۔
[3] اشباہ و نظائر سیوطی در نحو جلد ۲۔ تاریخ ابی الحدید جلد اول صفحہ ۶۔ [4] نہج البلاغہ سے رجوع کریں۔
[5] جنگ جمل کے دوران ایک عربی شخص نے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا امیر المومنین آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟" لوگوں نے ہر طرف سے اس پر اعتراضات کئے اور کہنے لگے "اے عربی، کیا تو حضرت علی کی پریشانی اور تشویق کو نہیں دیکھ رہا ہے کہ علمی بحث کرنا چاہتا ہے؟" حضرت علیؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا "اس آدمی کو اپنے حال پر چھوڑ دو کیونکہ اس قوم کے ساتھ جنگ سے بھی میرا مقصد عقائد اور دینی مقاصد کو واضح کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" اس کے بعد اس عربی شخص کے سوال کا جواب دینا شروع کر دیا۔ (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۶۵)
[6] تاریخ ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۶-۹۔

اور رشید ہجری وغیرہ موجود تھے جو اسلامی عرفاء اور علماء میں علم و عرفان کے سرچشمے مانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دوسری جماعت تیار کی جس میں سے بعض لوگ علم فقہ، علم کلام، علم تفسیر اور علم قرأت وغیرہ میں اپنے زمانے کے بہترین علماء اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔

خلافت کا معاویہ کی طرف چلے جانا اور پھر موروثی سلطنت میں تبدیل ہونا

امیر المومنین حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد آپ کی وصیّت اور عوام کی بیعت کے مطابق حضرت امام حسن بن علی ابن ابیطالب نے خلافت سنبھالی جو بارہ امامی شیعوں کے دوسرے امام ہیں۔

لیکن ادھر معاویہ آرام سے نہیں بیٹھا ہوا تھا، اس نے عراق پر چڑھائی کر دی جو اس زمانے میں خلافت کا مرکز تھا اور حسن ابن علی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

معاویہ نے مختلف فریبوں، حیلوں اور بہانوں سے اور بہت زیادہ مال و دولت خرچ کر کے آہستہ آہستہ حضرت حسن بن علیؑ کے طرفداروں اور اصحاب کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور آخر کار امام حسن کو مجبور کر دیا کہ صلح کے عنوان سے خلافت کو معاویہ کے حوالے کر دیں اور امام حسن بن علیؑ نے بھی اس شرط پر کہ معاویہ کی وفات کے بعد خلافت دوبارہ انہیں واپس لوٹا دی جائے اور ساتھ ہی ان کے دوستوں اور پیروکاروں پر بھی کسی قسم کا جبر و تشدد یا ظلم نہ ہو، خلافت معاویہ کے سپرد کر دی تھی۔[1]

۴۰ ھجری میں معاویہ نے خلافت پر قبضہ کر لیا اور فوراً عراق آیا۔ اس نے اپنی تقریر میں لوگوں کو متنبہ کیا اور کہا: "میں تمہارے ساتھ نماز، روزہ کے لئے جنگ نہیں کرتا تھا، بلکہ میں چاہتا تھا کہ تم پر حکومت کروں اور اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں"۔[2]

اور پھر کہا: "میں نے حسنؑ کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا وہ اب باطل اور منسوخ ہو چکا ہے"۔[3]

معاویہ نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا کہ وہ سیاست کو دین سے الگ اور جدا کر دے گا اور اس طرح

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۹۱ اور دوسری تمام کتب تواریخ۔

[2] و [3] تاریخ ابن ابی الحدید جلد ۴ صفحہ ۱۶۰۔ تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۲۴۔ تاریخ ابن الاثیر جلد ۳ صفحہ ۲۰۳۔

دینی قوانین کے بارے میں بھی کوئی ضمانت نہیں دے گا، البتہ یہ واضح ہے کہ ایسی حکومت، سلطنت اور بادشاہت ہے نہ کہ خلافت یا پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی، یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جو معاویہ کے پاس پہنچے تھے اور اس کے دربار میں رسائی حاصل کر سکے تھے، انہوں نے بادشاہ کی طرح اس کو سلام کیا تھا[1] اور وہ خود بھی بعض خصوصی مجالس میں اپنی حکومت کو خصوصی ملکیت اور بادشاہی سے تعبیر کیا کرتا تھا[2]۔ اگرچہ عام اور ظاہری طور پر لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو خلیفہ ہی کہا کرتا تھا، لیکن وہ بادشاہی یا سلطنت جو زور اور طاقت کے بل بوتے پر قائم ہو اس میں وراثت خود بخود آجاتی ہے اور آخر کار اس نے اپنی نیت اور خواہش کو جامۂ عمل پہنایا اور اپنے بیٹے یزید کو جو ایک بہت ہی لا اُبالی، آوارہ اور عیاش شخص تھا اسے ذرہ برابر بھی دینی شعور نہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہبی شخصیت رکھتا تھا، اپنا جانشین اور ولی عہد بنایا[3]۔ جس نے اپنی حکومت اور سلطنت کے دوران اس قدر شرمناک حوادث و واقعات کو جنم دیا کہ قیامت تک تاریخ اس سے شرمندہ رہے گی۔

معاویہ اپنے بیانات میں ہمیشہ اشارہ کیا کرتا تھا کہ وہ کبھی حسنؑ کو دوبارہ خلیفہ نہیں بننے دے گا اور خلافت کے بارے میں اپنے مرنے سے پہلے اس کے دماغ میں کچھ اور ہی خیال ہے اور یہ وہی خیال تھا جس کے ذریعے اس نے امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیا تھا[4]۔ اور اس طرح اپنے بیٹے یزید کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ معاویہ نے اپنے معاہدے کو توڑ کر عوام کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی بھی اہلبیتؑ کے

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۹۳۔

[2] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۰۲۔

[3] یزید ایک عیاش اور شہوت پرست انسان تھا جو ہمیشہ شراب کے نشے میں چور رہتا تھا۔ وہ بڑے قیمتی اور عریاں لباس پہنا کرتا تھا وہ کتوں اور بندروں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس کی راتوں کی محفلیں، ساز و آواز اور رقص و سرود کے ساتھ شروع ہوتی تھیں اس کے ایک بندر کا نام ابوقیس تھا، اسے وہ قیمتی لباس پہنایا کرتا تھا اور شراب کی محفل میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا کبھی کبھی اسے گھوڑے پر سوار کر کے گھوڑ دوڑ کے مقابلے کے لئے بھیجا کرتا تھا۔ (تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۹۶۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۷۷)

[4] مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۵۔ تاریخ ابوالفداء جلد اوّل صفحہ ۱۸۳۔

شیعوں کو امن و امان کے ماحول میں زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دے گا تاکہ پہلے کی طرح اپنی دینی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ اور آخر کار اس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔[1]

اس نے اعلان کیا کہ جو شخص بھی اہلبیتؑ کی تعریف اور شان میں کوئی حدیث بیان کرے گا، اس کے جان و مال کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں دی جائے گی۔[2] اس طرح اس نے حکم دیا کہ جو شخص تمام اصحاب رسولؐ اور خلفاءؓ کی تعریف میں کوئی حدیث بیان کرے گا اس کو بہت زیادہ انعام واکرام دیا جائے گا۔ اس حکم کے نتیجے میں صحابہ کی شان میں بہت زیادہ احادیث گھڑ لی گئیں۔[3] اس نے حکم دیا کہ تمام اسلامی ممالک میں منبروں پر خطبوں کے دوران حضرت علیؑ کو گالیاں دی جائیں (اور یہ حکم اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۹۹-۱۰۱ ہجری قمری کے زمانے تک جاری رہا) اس نے اپنے مددگاروں اور پیروکاروں کی مدد اور کوشش کے ذریعے جن میں بعض اصحابِ رسولؐ بھی تھے، حضرت علیؑ کے شیعوں اور خاص پیروکاروں کو ہلاک کروا دیا تھا اور ان میں سے بعض کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر شہروں میں پھرایا تھا۔ وہ عام شیعوں کو جہاں کہیں بھی دیکھتا، تکلیفیں، آزار اور شکنجے دیا کرتا تھا اور ان کو تلقین و تاکید کی جاتی تھی کہ وہ حضرت علیؑ کی پیروی کرنے سے باز رہیں اور جو شخص اس حکم کو قبول نہ کرتا اسے قتل کر دیا جاتا۔[4]

شیعوں کے لئے سب سے مشکل زمانہ

شیعہ افراد اور شیعہ مذہب کے لئے تاریخ میں سب سے مشکل حالات معاویہ کی بیس سالہ حکومت کے

---

[1] النصائح الکافیہ، صفحہ ۷۲ (کتاب الاحداث سے نقل کیا گیا ہے)

[2] ابوالحسن مدائنی اپنی کتاب "الاحداث" میں فرماتے ہیں: کتب معاویة نسخة واحدة الی عماله بعد عام الجماعة الی برئت الذمه ممن روی شیئاً من فضل ابی تراب واهل بیته کتاب النصائح الکافیة تالیف محمد بن عقیل طبع نجف ۱۳۸۶ ھجری صفحہ ۸۷ اور پھر النصائح الکافیہ صفحہ ۱۹۴۔

[3] النصائح الکافیہ صفحہ ۷۲-۷۳

[4] النصائح الکافیہ صفحہ ۵۸، ۶۴، ۷۷، ۷۸۔

دوران تھے جس وقت شیعوں کے لئے کسی قسم کا امن وچین موجود نہ تھا۔ اسی دوران میں اکثر شیعہ حضرات معروف اور مشہور ہو چکے تھے۔ ادھر شیعوں کے دو امام (امام دوم اور امام سوم) معاویہ کے زمانے میں حالات کو بہتر بنانے اور خلافت کو لوٹانے میں بے بس اور بے اختیار تھے۔ حتیٰ کہ شیعوں کے تیسرے امام (امام حسینؑ) یزید کی سلطنت کے پہلے چھ مہینوں کے دوران ہی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ اپنے دوستوں اور اصحاب و اولاد کے ساتھ یزید کی مخالفت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ امیر معاویہ کی آخری دس سالہ خلافت کے دوران اس کام کا امکان بھی نہ تھا کہ خلافت پھر دوبارہ اہل بیتؑ کو واپس مل جائے۔

اہلسنت کے اکثر افراد اس قسم کی خلاف ورزیوں اور ناحق قتل وغارت کو جو بعض اصحابِ رسولؐ اور خصوصاً معاویہ کے ہاتھوں ہوئیں اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ وہ رسولِ اکرمؐ کے اصحاب تھے اور اصحابِ رسولؐ مجتہد ہوتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کے مطابق ہر کام میں مجتہد اور معذور ہوتے ہیں، لہٰذا خدا ان سے راضی ہے اور ہر قسم کا جرم اور قتل جو ان سے سرزد ہوتا ہے، خداوند تعالیٰ اس کا حساب نہیں لیتا اور وہ بخش دیئے جاتے ہیں، لیکن شیعہ اس عذر کو تسلیم نہیں کرتے۔

سب سے پہلے تو یہ بات معقول اور پسندیدہ نظر نہیں آتی کہ پیغمبر اکرمؐ جیسا ایک عوامی اور معاشرتی رہبر ایک جماعت یا گروہ کو عدل و آزادی کی خاطر اپنا ہم عقیدہ بنائے اور ان کو ظلم وستم کے خلاف ابھارے اور ساتھ ہی اپنی تمام زندگی اسی مقدس اور پاک مقصد کی خاطر وقف کر دے اور اپنے خدائی نظریئے کو عملی جامہ پہنائے لیکن جب اپنے مقصد اور مطلب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اپنے دوستوں اور اصحاب کو عوام اور مقدس قوانین کے بارے میں مکمل آزادی دیدے تاکہ ہر قسم کی حق کشی، خلاف ورزی، تخریب کاری اور لاقانونیت وغیرہ ان کے لئے معاف ہو۔ اس کا مطلب یوں ہو گا کہ اس رہبر نے جن ہاتھوں سے اور جن ذرائع سے ایک عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی تھی انہیں ہاتھوں سے اس کو تباہ اور خراب کر دے۔

دوسرے یہ کہ وہ روایات اور احادیث جن سے صحابہ کرام کو مقدس، پاک اور ان کے ہر ناجائز اعمال کو صحیح اور جائز کہا جاتا ہے اور ایسے ہی ان کو قابل بخشش سمجھا جاتا ہے وہ خود صحابہ ہی سے ہم تک پہنچی ہیں یا ان سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ تاریخی شہادت کے مطابق خود صحابہ آپس میں ایک دوسرے کے بارے میں

اس قسم کی معذوریت اور بخشش کے قائل نہیں تھے، کیونکہ یہ اصحاب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک دوسرے کو بدنام کرنے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کے لئے زبان کھولی تھی اور ایک دوسرے کے عیوب اور اشتباہات کو بالکل نظرانداز نہیں کیا کرتے تھے۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں خود صحابہ کی گواہی کے مطابق بھی یہ روایات و احادیث صحیح نہیں ہیں اور اگر ٹھیک، درست اور صحیح ہوں بھی تو ان کے معنی بھی دوسرے ہوں گے اور ان سے صحابہ کی تقدیس (مقدس اور پاک ہونے) یا قابل بخشش ہونے کا مقصد ہرگز نہیں ہوگا۔

اور اگر فرض کریں کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے بارے میں کسی وقت اپنے کلام پاک میں ان کی خدمت دین کے صلے میں یا کوئی خدائی فرمان جاری اور نافذ کرنے کی خاطر ان سے راضی ہو جانے کا اعلان فرمایا ہے[1]۔ تو اس کا مطلب ان اصحاب کی گزشتہ فرمانبرداری اور اطاعت کی قدردانی ہوگا نہ کہ آئندہ اور مستقبل میں ہر قسم کی نافرمانی اور خلاف ورزی یا اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت کے متعلق تصدیق۔

بنوامیہ کی سلطنت کا قیام

۶۰ ہجری قمری میں معاویہ فوت ہوگیا اور اس کے بیٹے یزید نے اس بیعت کے مطابق جو اس کے باپ نے اس کے لئے عوام سے حاصل کی تھی، اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

تاریخی شہادت کے مطابق یزید کوئی دینی شخصیت نہ رکھتا تھا، وہ ایک ایسا جوان تھا جو حتیٰ کہ اپنے باپ کی زندگی میں بھی اسلامی قوانین و اصول کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا بلکہ عیاشی، لاقانونیت اور شہوت رانی

---

[1] وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (سورۃ التوبہ آیت ۱۰۰) ترجمہ: اور مہاجرین اور انصار میں سے (ایمان کی طرف) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنہوں نے نیک نیتی سے (قبول ایمان میں) ان کا ساتھ دیا، خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش اور ان کے واسطے خدا نے وہ (ہرے بھرے) باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں تیار کر رکھے ہیں وہ ہمیشہ ابدالآباد تک ان میں رہیں گے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

کے سوا اسے کوئی کام ہی نہ تھا۔ اس نے اپنی تین سالہ حکومت کے دوران ایسی تباہی اور بربادی مچائی اور ایسے جرائم کا مرتکب ہوا جن کی مثال تاریخ اسلام میں ہرگز نہیں ملتی۔ اگرچہ اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے بہت سے فتنے منظر عام پر آچکے تھے مگر یزید ان سب پر بازی لے گیا تھا۔

اس نے اپنی حکومت کے پہلے سال میں حضرت حسین بن علیؑ کو جو پیغمبر اکرمؐ کے نواسے تھے، ان کے اصحاب و اولاد، بچوں اور عورتوں سمیت بڑی بیدردی اور بے رحمی سے شہید کر دیا تھا اور اہلبیتؑ کی عورتوں کو شہیدوں کے سروں کے ساتھ شہر بشہر پھرایا تھا۔[۱]

پھر دوسرے سال اس نے مدینہ منورہ میں قتل عام کیا اور عوام کے مال و جان کو تین دن تک کے لئے اپنی افواج پر حلال کر دیا تھا۔[۲] اور تیسرے سال خانہ کعبہ کو گرا کر آگ لگا دی تھی۔[۳] یزید کے بعد بنو امیہ کے خاندان آل مروان نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی جیسا کہ تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس خاندان کے گیارہ حکمرانوں نے تقریباً ۷۰ سال تک حکومت کی۔ انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کے لئے بدترین اور مشکل ترین حالات پیدا کر دیئے تھے، لہٰذا اس زمانے میں اسلامی ممالک میں ایک استبدادی اور ظالمانہ بادشاہی وجود میں آگئی تھی جس کو اسلامی خلافت کا نام دیا گیا تھا اور ان کی حکومت کے دوران حالات یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ خلیفہ وقت جو پیغمبر اکرمؐ کا جانشین اور دین مبین کا حامی سمجھا جاتا تھا، اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ خانۂ کعبہ کے اوپر ایک بارہ دری بنائے تاکہ زمانۂ حج میں وہاں بیٹھ کر خاص طور پر عیاشی کر سکے۔[۴]

خلیفۂ وقت نے قرآن مجید کو تیر کا نشانہ بنایا اور قرآن مجید کے متعلق ایک نظم لکھی جس میں کہا گیا تھا:
"اے قرآن، قیامت کے دن جب تو اپنے خدا کے حضور حاضر ہوگا تو اس وقت خدا سے کہنا کہ خلیفہ

۱۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۱۶۔ تاریخ ابوالفداء جلد اول صفحہ ۱۹۰۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۶۴، اور دوسری تواریخ

۲۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۴۳۔ تاریخ ابوالفداء جلد اول صفحہ ۱۹۲۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۷۸۔

۳۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۴۔ تاریخ ابوالفداء جلد اول صفحہ ۱۹۲۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۸۱۔

۴۔ ولید بن یزید۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۷۳ (اِذَا مَا جِئْتَ رَبَّکَ یَوْمَ بَعْثٍ فَقُلْ یَا رَبِّ مَزَّقَنِی الْوَلِیْدُ)

نے مجھے پھاڑ دیا تھا۔" [1]

البتہ شیعہ جو اہلسنت سے بنیادی طور پر خلافت اور دینی رہبری کے دو مسائل میں اختلافِ نظر رکھتے تھے، اس تاریک دور میں سخت مشکل حالات میں زندگی گزارتے تھے لیکن اس زمانے کی حکومتوں کے ظلم وستم اور لاقانونیت کے طریقوں اور دوسری طرف اہلبیت کے اماموں کی مظلومیت، طہارت، تقویٰ و پاکی وغیرہ ان کو اپنے عقائد میں مضبوط اور محکم کر رہے تھے اور خصوصاً شیعوں کے تیسرے امام حضرت حسین علیہ السلام کی دلخراش شہادت شیعوں کی افزائش کا باعث بنی اور خاص کر مرکز خلافت (دارالخلافہ) سے دور دراز علاقوں مثلاً عراق، یمن اور ایران میں۔

اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ شیعوں کے پانچویں امام کے زمانۂ امامت میں جبکہ پہلی صدی ہجری ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور تیسرے امامؑ کی شہادت کو چالیس سال بھی نہیں ہوئے تھے، اموی حکومت میں کمزوری اور ضعف کے باعث شیعہ، اسلامی ممالک کے کونے کونے سے پانچویں امام کے اردگرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے تاکہ علمِ حدیث اور علمِ دین حاصل کر سکیں۔ [2] ابھی پہلی صدی ہجری اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ حکومت کے چند ایک اعلیٰ عہدیداروں نے ایران میں شہر قم کی بنیاد رکھی اور اس شہر میں شیعوں کو لاکر آباد کیا۔ [3] لیکن اس کے باوجود شیعہ چھپ چھپا کر اور اپنے مذہب کا اعلان کئے بغیر زندگی گزارتے رہے۔ اس دوران کئی بار علوی سادات نے اپنے اپنے زمانے کی حکومتوں کے ظلم وستم اور دباؤ کے خلاف تحریکیں شروع کیں لیکن ان کو ہر بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور آخر کار اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگاتے رہے مگر اس وقت کی حکومتوں نے ان کے جان و مال کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ حضرت زید بن علیؑ جو شیعہ زیدیہ کے امام تھے، ان کی نعش کو قبر سے نکال کر سولی چڑھایا گیا اور یہ لاش تین سال تک سولی پر لٹکتی رہی، اس کے بعد لاش کو سولی سے اتار کر آگ میں جلا دیا گیا اور راکھ کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ [4] یہاں تک کہ اکثر شیعہ جو چوتھے اور پانچوں امام

---

[1] ولید بن یزید۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۲۳۸۔

[2] بحث امام شناسی، مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۲۲۸۔

[3] معجم البلدان، مادہ قم۔

[4] مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۲۱۷۔۲۱۹۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۶۶۔

کے معتقد اور پیروکار تھے بنو امیّہ کے ہاتھوں زہر دے کر شہید کر دیئے گئے۔[۱] اور اسی طرح امام دوّمؑ اور امام سوّمؑ کی شہادت بھی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

امویوں کے ظلم وستم اس قدر واضح اور زیادہ تھے کہ اکثر اہلسنّت کے افراد اگرچہ عام طور پر خلفاء کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتے تھے لیکن ان کے ظلم وستم کی وجہ سے مجبور ہو گئے کہ خلفاء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیں یعنی خلفائے راشدین جو پہلے چار خلفاء تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین بنے (ابوبکر، عمر، عثمان، علی) اور خلفائے راشدین کے علاوہ دوسرے خلفاء جو معاویہ سے شروع ہوتے ہیں۔

اموی خاندان اپنی حکومت میں ظلم وستم اور بیدادگری و لاقانونیّت کی وجہ سے لوگوں کے لئے باعثِ نفرت بن چکا تھا۔ امویوں کی شکست اور اس خاندان کے آخری خلیفہ کے قتل کے بعد خلیفہ کے دو بیٹے اپنے خاندان کے ہمراہ دارالخلافہ سے بھاگ کھڑے ہوئے، وہ جہاں کہیں بھی جاتے ان کو پناہ نہیں ملتی تھی آخرکار پریشانی اور سرگردانی کی حالت میں نوبہ، حبشہ اور بجادہ کے میدانوں اور صحراؤں میں اس خاندان کے اکثر افراد بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو گئے لیکن جو افراد بچے وہ یمن کے جنوبی حصے میں پہنچ گئے اور لوگوں سے راستے کا خرچ حاصل کرنے کے لئے گداگری کیا کرتے تھے۔ ذی حمالان شہر سے مکّہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں جاکر لوگوں کے درمیان روپوش ہو گئے۔[۲]

دوسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

دوسری صدی ہجری کی پہلی تہائی کے آخر میں تمام اسلامی ممالک میں بنو امیّہ حکومت کے ظلم وستم اور بدسلوکی کی وجہ سے جو انقلابات اور خونی جنگیں ہوئیں، ان میں پیغمبر اکرمؐ کے اہلبیتؑ کے نام پر ایران کے مشرقی صوبے خراسان میں بھی ایک تحریک نے جنم لیا۔ اس تحریک کا رہنما ایک ایرانی سپہ سالار اور جرنیل ابومسلم مروزی تھا جس نے اموی خلافت کے خاتمے کی تحریک شروع کی تھی اور اپنی اس انقلابی تحریک میں کافی ترقی

---

[۱] بحار الانوار جلد ۱۲ اور دوسری تمام شیعہ دستاویزات۔

[۲] تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۸۴۔

اور کامیابی حاصل کرلی تھی یہاں تک کہ اموی خلافت یا سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔[1] یہ تحریک اور انقلاب اگرچہ زیادہ تر شیعہ مذہب کے پروپیگنڈوں پر منحصر تھا اور تقریباً اہلبیتؑ کے شہیدوں کے انتقام کے عنوان سے اہلبیتؑ کے ایک پسندیدہ شخص کے لئے بیعت لیا کرتے تھے (مگر اس شخص کا نام نہیں لیا جاتا تھا) لیکن اس کے باوجود شیعہ اماموں کا نہ تو اس کام کے لئے حکم تھا اور نہ ہی انہوں نے اس کے لئے کوئی اشارہ کیا تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ابو مسلم نے امام ششم کا نام مدینہ میں بیعت کے لئے پیش کیا تو انہوں نے سختی سے اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔ اور فرمایا تھا: "تو میرے آدمیوں (پیروکاروں) میں سے نہیں ہے اور یہ زمانہ بھی میرا زمانہ نہیں ہے۔[2]

آخر کار بنو عباس خاندان نے اہلبیتؑ کے نام پر خلافت پر قبضہ کر لیا۔[3] شروع شروع میں اس خاندان کے خلفاء، عوام، شیعہ اور ایسے ہی علوی خاندان کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے حتیٰ کہ علوی شہدا کے انتقام کے نام سے انہوں نے بنی امیہ کا قتلِ عام بھی کیا اور خلفائے بنو امیہ کی قبروں کو کھود کر ان کی ہڈیاں بھی جلا دیں۔[4] لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انہوں نے بھی بنو امیہ کا سا ظالمانہ طریقہ اختیار کر لیا اور اس طرح ظلم و ستم اور لاقانونیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

امام ابو حنیفہ جو اہلسنت کے چار اماموں میں سے ایک ہیں، خلیفہ عباسی (منصور) نے ان کو قید میں ڈال دیا[5] اور ان کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ امام احمد حنبل جو اہلسنت کے دوسرے امام تھے ان کو سر عام کوڑے لگائے گئے۔[6] اور اسی طرح شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادقؑ کو سخت ترین شکنجوں، اذیتوں اور تکلیفوں کے بعد زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔[7] اس حکومت کے دوران علوی خاندان کے افراد کو اکٹھا کر کے ان کی گردنیں اڑا دی جاتی تھیں یا ان کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور کبھی کبھی بعض افراد کو دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا یا سرکاری

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد ۳، صفحہ ۷۹۔ تاریخ ابوالفدا جلد اول صفحہ ۲۰۸ اور دوسری تواریخ۔

[2] و [3] " صفحہ ۸۶۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۲۶۸۔ [4] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۹۱-۹۶۔ تاریخ ابی الفداء جلد اول صفحہ ۲۱۲۔

[5] تاریخ ابی الفداء جلد ۲ صفحہ ۶۔ [6] " جلد ۳ صفحہ ۱۹۸۔ " جلد ۲ صفحہ ۳۳۔

[7] کتاب بحار الانوار جلد ۱۲۔ حالات امام جعفر صادقؑ۔

عمارتوں کے نیچے دفن کر دیا جاتا تھا۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں اسلامی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور بہت زیادہ وسعت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ کبھی کبھی خلیفہ سورج کو دیکھ کر کہا کرتا تھا: "(اے سورج) جہاں بھی تیرا دل چاہے اپنی شعاعیں زمین پر پھینک (چمک) لیکن میرے ملک سے باہر ہرگز نہیں چمکے گا (یعنی جہاں تک سورج چمکتا ہے وہاں تک میرا ملک ہے)"۔ ایک طرف تو اس کی فوجیں مشرق و مغرب کی طرف آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور دوسری طرف بغداد کے پل پر جو خلیفہ کے محل سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا خلیفہ کی اجازت کے بغیر اس کے گماشتے پل پر سے گزرنے والوں سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک دن جب خود خلیفہ اس پل پر سے گزرنا چاہتا تھا تو انہوں نے اس کا راستہ روک کر اس سے ٹیکس ادا کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔[1]

ایک گانے والے شخص نے چند شہوت انگیز شعر پڑھ کر عباسی خلیفہ امین کی شہوت کو ابھارا تو امین نے اسے تیس لاکھ چاندی کے درہم انعام میں دیئے۔ وہ گانے والا اس قدر خوش ہوا کہ خلیفہ کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا: "اے امیر المومنین، کیا آپ نے یہ ساری رقم مجھے عطا فرما دی ہے؟" خلیفہ نے جواب دیا: "اس رقم کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ یہ ساری رقم ہمیں ملک کے ایک ایسے حصے سے ملی ہے جس کو ہم جانتے بھی نہیں"۔[2]

وہ بے اندازہ اور بے شمار دولت جو اسلامی ممالک سے بیت المال کے عنوان سے ہر سال دار الخلافہ میں پہنچتی تھی وہ سب کی سب خلیفۂ وقت کی شہوت پرستی، ہوس رانی، عیاشی اور ایسے ہی عوام کی حق تلفی پر خرچ ہوتی تھی، ان خوبصورت کنیزوں، لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی جو ہر وقت خلیفہ کے دربار میں خدمت پر مامور تھے۔

اموی حکومت کے خاتمے پر اور بنو عباس کے اقتدار سے شیعوں کی حالت میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ ان کے ظالم اور بیداد گر دشمنوں نے صرف اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔

---

[1] قصہ جسر بغداد (بغداد کے پل کا قصہ) [2] کتاب آغانی ابی الفرج، قصاصین، خلیفہ عباسی۔

تیسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

تیسری صدی ہجری کے آغاز سے شیعوں نے تازہ سانس لیا، اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ یونانی، سریانی اور دوسری زبانوں سے بہت زیادہ علمی اور فلسفی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوگئی تھیں اور لوگ استدلالی و عقلی علوم کو حاصل کرنے کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ عباسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۵ تا ۲۱۸ ہجری قمری) معتزلہ مذہب کا پیرو تھا اور مذہب میں عقلی استدلال کی طرف مائل تھا لہٰذا اس نے مختلف ادیان اور مذاہب میں نقطی استدلال کے رواج کی عام آزادی دے رکھی تھی، یہی وجہ تھی کہ علماء اور شیعہ متکلمین (علم کلام کے ماہرین) نے اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اہلبیتؑ کے مذہب کی تبلیغ میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔[1]

دوسرے یہ کہ خلیفہ مامون الرشید نے سیاسی حالات کے پیش نظر شیعوں کے آٹھویں امام (حضرت رضا علیہ السلام) کو اپنا ولی عہد اور جانشین بھی بنایا ہوا تھا جس کے نتیجے میں علوی خاندان اور اہلبیت کے دوست اور طرفدار ایک حد تک سرکاری عہدیداروں کے ظلم و تشدد سے محفوظ ہو چکے تھے اور کم و بیش آزاد تھے، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دوبارہ تلوار کی تیز دھار شیعوں کی طرف پھر گئی اور ان کے اسلاف کے طریقے اور حالات ان کے لئے بھی پیدا ہو گئے، خصوصاً عباسی خلیفہ متوکل باللہ (۲۳۲ تا ۲۴۷ ہجری قمری) کے زمانے میں جو حضرت علیؑ اور آپ کے پیروکاروں سے خصوصی دشمنی رکھتا تھا اور اسی کے حکم سے شیعوں کے تیسرے امام (حسین علیہ السلام) کا مزار مقدس کربلا میں گرا کر خاک کے ساتھ یکساں کر دیا گیا۔[2]

چوتھی صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

چوتھی صدی ہجری کے دوران کچھ ایسے عناصر اور حالات پیدا ہو گئے تھے جو خود بخود مذہب شیعہ کی ترقی اور شیعوں کے طاقتور اور مضبوط بننے میں مدد کر رہے تھے۔ ان حالات میں سے خلافت بنو عباس

---

[1] مختلف التواریخ۔

[2] تاریخ ابی الفداء اور دوسری تاریخی کتابیں۔

کی کمزوری اور آلِ بویہ بادشاہوں کا ان کے مقابلے میں سر اٹھانا تھا۔

آلِ بویہ کے بادشاہ جو مذہبی طور پر شیعہ تھے اور خلافت کے مرکز (دارالخلافہ) بغداد میں اور ایسے ہی خلیفہ کے دربار میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا۔[1] اور یہ شیعوں کے لئے ایک قابل توجہ طاقت تھی جو دن بدن ان کو زیادہ سے زیادہ جرأت مند اور طاقتور بنا رہی تھی تاکہ وہ اپنے مذہبی مخالفوں کے سامنے جو ہمیشہ خلافت کی طاقت پر بھروسہ اور تکیہ رکھتے ہوئے ان کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے، کھڑے ہو جائیں اور ان کا مقابلہ کریں اور اس کے ساتھ ساتھ پوری آزادی کے ساتھ اپنے (شیعہ) مذہب کی تبلیغ کریں۔

جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس صدی کے دوران سارے جزیرۃ العرب یا اس کے زیادہ حصے میں، بڑے بڑے شہروں کے علاوہ سب جگہ شیعہ آباد تھے لیکن ان کے علاوہ کچھ بڑے شہر بھی مثلاً ہجر، عمان اور صعدہ وغیرہ شیعوں کے شہر شمار ہوتے تھے۔ شہر بصرہ میں بھی شیعوں کی قابل توجہ تعداد موجود تھی حالانکہ وہ شہر ہمیشہ سے اہلسنّت کا مرکز تھا اور شہر کوفہ کے ساتھ جو شیعوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا مذہبی رقابت اور برابری رکھتا تھا اور اسی طرح دوسرے شہروں مثلاً طرابلس، نابلس، طبریہ، حلب اور ہرات میں بھی بہت زیادہ شیعہ زندگی گزارتے تھے، اس کے علاوہ اہواز، خلیج فارس کے کنارے (ایرانی ساحل) پر بھی شیعوں کی تعداد قابل ملاحظہ تھی۔[2]

اسی صدی کے آغاز میں ہی ناصر اطروش جو کئی سال تک ایران کے شمالی حصوں میں مذہب شیعہ کی تبلیغ کر رہا تھا، طبرستان کے علاقے پر قابض ہو گیا تھا اور وہاں اس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی جو کئی پشتوں تک جاری رہی، اطروش سے پہلے بھی ایک شخص بنام حسن بن زید علوی نے کئی سال تک طبرستان میں حکومت کی تھی۔[3]

اس صدی کے دوران فاطمیوں نے جو اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے مصر میں اقتدار حکومت سنبھال لیا اور ۲۹۶ھ سے ۵۲۷ء تک حکومت کرتے رہے۔[4]

---

[1] کتب تواریخ کی طرف رجوع کریں۔ [2] الحضارۃ الاسلامیہ جلد اوّل صفحہ ۹۷۔

[3] مروج الذہب جلد ۴ صفحہ ۳۷۔ الملل والنحل جلد اول صفحہ ۲۵۴ [4] تاریخ ابی الفداء جلد ۲ صفحہ ۶۳، جلد ۳ صفحہ ۵۰۔

اسی زمانے میں عام طور پر ایسے حالات پیش آتے رہے کہ بڑے بڑے اسلامی شہروں مثلاً بغداد، بصرہ اور نیشاپور میں شیعہ سنی فرقوں کے درمیان کبھی کبھی کشمکش اور جنگ شروع ہو جاتی تھی اور ان جنگوں میں سے بعض میں شیعوں کو کامیابی ہوتی تھی۔

پانچویں صدی سے لیکر نویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

پانچویں صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک شیعوں کی تعداد میں مسلسل خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کے دوران ان کی افزائش جاری رہی۔ اس دوران میں بعض ایسے بادشاہوں نے بھی حکومت کی جو شیعہ تھے اور مذہب شیعہ کو رواج دیتے رہے۔

پانچویں صدی ہجری کے آخر میں اسمٰعیلیہ کی تحریک اور دعوت نے "الموت" کے علاقوں میں اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا تھا اور اس طرح اسمٰعیلی فرقے کے بادشاہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک ایران کے بالکل درمیانی حصے میں مکمل آزادی کے ساتھ اور اپنی مذہبی رسومات کے مطابق زندگی گزارتے رہے۔[1] مرعشی سادات نے بھی کئی سالوں تک مازندران کے علاقوں پر حکومت کی تھی۔[2]

مغلوں کے ایک بادشاہ خدابندہ لو نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا اور اس کی اولاد میں سے بھی بہت زیادہ بادشاہوں نے ایران میں سلطنت اور حکومت کی تھی اور چونکہ یہ سب لوگ شیعہ تھے اس لئے وہ سب مذہب شیعہ کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں رہے تھے۔ اسی طرح آق قویونلو اور قرہ قویونلو خاندان کے سلاطین جو تبریز میں حکومت کیا کرتے تھے[3]۔ اور ان کی حکمرانی اور بادشاہت کی وسعت فارس (شیراز) اور کرمان تک پہنچ چکی تھی، مذہب شیعہ کے پیرو تھے۔ مصر میں بھی سالہا سال تک فاطمیوں کی حکومت قائم رہی تھی۔

---

[1] تاریخ کامل، تاریخ روضۃ الصفا اور تاریخ حبیب السیر کی طرف رجوع کریں۔

[2] تاریخ کامل اور تاریخ ابی الفدا جلد ۳۔

[3] تاریخ حبیب السیر۔

البتہ مذہبی طاقت مختلف بادشاہوں کے زمانے میں مختلف رہی ہے جیساکہ فاطمی حکومت کے خاتمے اور سلاطین آلِ ایوب کے اقتدار سنبھالنے سے حالات بالکل پھر گئے تھے۔ مصر اور شام کے شیعوں کی آزادی چھن گئی اور بہت سے شیعہ افراد کو قتل کر دیا گیا۔[1]

انہی شہید ہونے والوں میں سے شہید اوّل محمد بن مکی بھی تھے جو شیعہ فقہ کے ذہین ترین افراد میں سے تھے اور ۷۸۶ھ کو دمشق میں مذہب شیعہ رکھنے کے جرم میں شہید کر دیئے گئے تھے۔[2] اور اسی طرح شیخ اشراق شہاب الدین سہروردی کو حلب میں فلسفہ کے جرم میں شہید کر دیا گیا تھا۔[3]

مجموعی اور کلی طور پر ان پانچ صدیوں میں شیعہ آبادی کے لحاظ سے مسلسل بڑھتے رہے اور طاقت و آزادی کے لحاظ سے اپنے وقت کے بادشاہوں کی مرضی یا مخالفت کے ماتحت رہے۔ اور اس تمام مدت اور عرصے میں اسلامی ممالک میں سے ایک ملک میں بھی مذہب شیعہ کو سرکاری اور ملکی مذہب ہونے کا موقع نہ ملا اور نہ ہی کسی نے اس کا اعلان کیا یا اسے سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کیا۔

دسویں اور گیارہویں صدی کے دوران شیعوں کی حالت

۹۰۶ ہجری قمری میں شیخ صفی الدین اردبیلی (متوفی ۷۳۵ھ) کے خاندان میں سے ایک تیرہ سالہ نوجوان نے جو مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھا اپنے آباء و اجداد کے تین سو مریدوں اور درویشوں کو ساتھ لے کر حکومتِ وقت کے خلاف سر اٹھایا تاکہ ایک مستقل، خود مختار اور آزاد شیعہ ریاست کو معرض وجود میں لائے اس لئے وہ اردبیل سے اٹھا اور کشور کشائی کرتے ہوئے طوائف الملوکی کو ایران سے ختم کر دیا۔ اس نے علاقائی بادشاہوں اور خصوصاً آل عثمان خاندان کے بادشاہوں کے ساتھ خونریز جنگیں کیں، یہاں تک کہ ایران کو جو اس وقت حصوں بخروں میں تقسیم ہو چکا تھا، ایک متحدہ اور آزاد ملک بنا دیا اور مذہبِ شیعہ

---

[1] تاریخ حبیب السیر اور تاریخ ابی الفدا وغیرہ۔

[2] روضات الجنات اور ریاض العلماء (نقل از ریحانۃ الادب جلد ۲ صفحہ ۳۶۵۔

[3] روضات الجنات۔ کتاب المجالس اور وفیات الاعیان۔

کو اپنی حکومت اور قلمرو میں سرکاری مذہب کا درجہ دے کر رواج دیا۔[1] شاہ اسمٰعیل صفوی کی وفات کے بعد صفوی خاندان کے دوسرے بادشاہوں نے بارہویں صدی ہجری تک ایران میں اپنی حکومت جاری رکھی اور سب نے یکے بعد دیگرے شیعہ امامیہ مذہب کو سرکاری مذہب کے طور پر تصدیق اور تسلیم کیا اور اس کو مضبوط بنانے کے لئے کسی کوشش اور جدوجہد یا حتیٰ کہ جنگوں سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں تک کہ یہ خاندان جب اپنے عروج پر تھا (یعنی شاہ عباس صفوی کے زمانے میں) اس نے ملکی آبادی اور وسعت کو موجودہ ایران (یعنی ۱۳۸۴ھ) سے دوگنا کر دیا تھا۔[2]

شیعہ جماعت اس آخری اڑھائی سو سال کے عرصے میں تقریباً تمام اسلامی ممالک میں اسی طرح ترقی کرتی رہی اور اس کی تعداد میں مسلسل اور روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔

بارہویں سے پندرہویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

آخری تین صدیوں کے دوران شیعوں کی مذہبی ترقی اپنی سابقہ حالت اور شکل میں جاری رہی ہے اور اب جبکہ چودہویں صدی کا آخری حصہ گزر رہا ہے، مذہبِ شیعہ ایران میں سرکاری اور عوامی مذہب کے طور پر پہچانا جاتا ہے اور اسی طرح دوسرے بہت سے اسلامی ممالک مثلاً یمن، عراق میں شیعوں کی اکثریت ہے۔ ان کے علاوہ تمام اسلامی ممالک میں بھی کم و بیش شیعہ افراد زندگی گزار رہے ہیں، لیکن مجموعی طور پر دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں میں شیعہ آبادی تقریباً ایک سو ملین (دس کروڑ) نفوس پر مشتمل ہے۔

شیعوں کے مختلف فرقے

- اصلی فرقے اور بعض فرقوں کا خاتمہ۔
- زیدیہ فرقہ۔
- اسمٰعیلیہ مذہب اور اس کے مختلف فرقے۔
- نزاریہ، مستعلیہ، دروزیہ اور مقنعہ۔
- بارہ امامی شیعہ اور ان کا زیدیہ اور اسمٰعیلیہ سے اختلاف۔
- بارہ امامی شیعہ کی تاریخ پر ایک نظر۔

اصلی فرقے

ہر مذہب میں کم و بیش ایسے مسائل موجود ہوتے ہیں جو اس مذہب کے بنیادی اصول سمجھے اور گنے جاتے ہیں اور اسی طرح ہر مذہب میں بعض دوسرے درجے کے مسائل بھی موجود ہوتے ہیں لہٰذا اصلی مسائل کی کیفیت اور حقیقت میں اہل مذہب کا اختلاف، فرقوں کے اشتراک کی اصلیت اور اصولوں کی بنیاد پر شمار کیا جاتا ہے۔

دنیا کے تمام ادیان و مذاہب میں بہت سے فرقے موجود ہیں۔ خصوصاً چار آسمانی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور اسلام میں، بلکہ تمام اور مذاہب کے فرقوں میں بھی چھوٹے چھوٹے فرقے موجود ہیں۔ مذہب شیعہ میں پہلے تین اماموں (یعنی حضرت امیرالمومنین علی ابن ابیطالب حضرت امام حسن بن علی اور حضرت امام حسین بن علی علیہم السلام) کے زمانوں میں کوئی فرقہ موجود نہ تھا لیکن امام سوم (حضرت امام حسین علیہ السلام) کی شہادت کے بعد شیعوں کی اکثریت حضرت امام علی بن حسین (زین العابدین سجادؑ) کی پیروکار اور قائل ہوگئی جبکہ اقلیت نے جس کو "کیسانیہ"

کہا جاتا ہے حضرت علیؑ کے تیسرے بیٹے محمد بن حنفیہ کو اپنا امام بنالیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق محمد بن حنفیہ چوتھے امام ہیں اور وہی امام مہدی ہیں جو کوہ رضوی میں غائب ہو گئے تھے اور آخری زمانے میں امام مہدی کے نام سے ظاہر ہونگے۔

امام سجادؑ (زین العابدین) کی رحلت کے بعد شیعوں کی اکثریت نے آپ کے فرزند حضرت امام محمد باقرؑ کی بیعت کر لی لیکن ایک اقلیت نے امام سجادؑ کے دوسرے بیٹے زید شہید کو اپنا ہادی، رہنما اور امام بنالیا لہٰذا ان کو اسی وجہ سے "زیدیہ" کہا جاتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی رحلت کے بعد ان کے پیروکاروں اور شیعوں نے ان کے فرزند ارجمند حضرت امام جعفر صادقؑ کی بیعت کر لی اور ان کی امامت پر ایمان لائے۔ آپ کی وفات کے بعد اکثریت شیعہ نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کو اپنا امام تسلیم کر لیا، لیکن ایک تعداد نے حضرت اسمٰعیل کو جو کہ چھوٹے امام کے بڑے بیٹے تھے اور حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے، اپنا امام سمجھا اور یہ جماعت جو اکثریت سے الگ ہو گئی تھی اس کو "اسمٰعیلیہ" کہا گیا۔ اس کے علاوہ بعض افراد نے امام ہفتمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت عبداللہ افطح کی پیروی اختیار کر لی اور بعض لوگ ساتویں امام کے فرزند حضرت محمد (امام رضاؑ) کے پیروکار ہو گئے، لیکن بعض نے خود امام ہفتمؑ کو ہی اپنا امام، ولی اور پیشوا قرار دیا اور انہی کو آخری امام سمجھا۔

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کے بعد اکثریت شیعہ نے حضرت امام رضاؑ کو آٹھواں امام مانا لیکن بعض نے ساتویں امام کو ہی آخری امام سمجھا، لہٰذا ان کو "واقفیہ" کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد آٹھویں امامؑ سے لے کر بارہویں امامؑ تک جو اکثریت شیعہ کے ایمان و اعتقاد کے مطابق مہدی موعود اور امام آخر الزمان ہیں، کوئی قابل توجہ فرقہ پیدا نہ ہوا اور اگر فرقوں کی صورت میں بعض واقعات و حالات پیدا ہوئے بھی تو وہ صرف چند روز سے زیادہ دیر تک کے لئے قائم نہ رہ سکے اور وہ خود بخود ہی ختم ہو گئے۔ مثلاً دسویں امامؑ کے بیٹے حضرت جعفر نے اپنے بھائی یعنی گیارہویں امامؑ (حسن عسکری) کے بعد امامت کا دعویٰ کیا تھا اور ایک جماعت نے ان کو اپنا امام تسلیم

بھی کرلیا تھا لیکن یہ گروہ تھوڑے ہی عرصہ میں منتشر ہوگیا تھا اور حضرت جعفر نے بھی اپنے دعوے سے ہاتھ اٹھالیا لہٰذا وہ فرقہ جاری نہ رہ سکا۔ اسی طرح شیعہ علماء کے درمیان بعض دوسرے اختلافات بھی موجود ہیں لیکن ان اختلافات کو مذہبی فرقوں کے طور پر شمار نہیں کیا جاسکتا۔

مذکورہ بالا فرقے، اکثریت شیعہ کے مقابلے میں پیدا ہوتے رہے لیکن تھوڑے عرصے میں ہی خود بخود ختم اور معطل ہوتے گئے سوائے دو فرقوں "زیدیہ اور اسمٰعیلیہ" کے جو ابھی تک موجود ہیں اور ان کے ماننے والے اب بھی مختلف ملکوں مثلاً یمن، پاکستان، ہندوستان، لبنان اور دوسری جگہوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی لئے اکثریت بارہ امامی شیعوں کے ساتھ ساتھ صرف انہی دو فرقوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے کیونکہ یہی دو فرقے دوسرے شیعہ فرقوں کے درمیان اہم ترین فرقے ہیں۔

شیعہ زیدیہ

زیدیہ حضرت امام سجادؑ (زین العابدین) کے فرزند زید شہید کے پیروکار ہیں۔ زید نے ۱۲۱ھ میں اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف تحریک چلائی اور ایک بڑی جماعت نے ان کی بیعت کرلی تھی، لیکن شہر کوفہ میں ان کے مریدوں اور پیروکاروں اور اموی خلیفہ کی فوج کے درمیان جنگ ہوئی اور حضرت زید بھی اس جنگ میں شہید ہوگئے۔

زید شہید اپنے ماننے والوں اور پیروکاروں کے لئے اہلبیتؑ کے پانچویں امام شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ بن زید جنہوں نے اموی خلیفہ ولید بن یزید کے خلاف تحریک چلائی تھی اور شہید ہوگئے تھے، آپ کے جانشین مقرر ہوئے۔ ان کے بعد محمد بن عبداللہ اور ابراہیم بن عبداللہ جنہوں نے عباسی خلیفہ منصور دوانقی کے خلاف مہم شروع کی تھی اور یکے بعد دیگرے دونوں شہید ہوگئے تھے، فرقہ زیدیہ کے امام سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کچھ مدت کے لئے زیدیہ فرقہ غیر منظم رہا، یہاں تک کہ ناصر اطروش نے جو حضرت زید کے بھائی کی اولاد میں سے تھا، خراسان میں اپنی امامت کا اعلان کردیا۔ وہاں کی حکومت نے اس کو گرفتار

کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر مازندران پہنچ گیا جہاں کے لوگوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا وہاں اس نے تیرہ سال اسلام کی تبلیغ کی اور بہت زیادہ افراد کو مسلمان بنا کر زیدیہ مذہب کا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس کے بعد انہی افراد کی مدد سے طبرستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اپنی امامت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں سے بعض افراد نے کافی عرصے تک اس علاقے میں اپنی حکومت اور امامت جاری رکھی۔

زیدیہ فرقے کے عقیدے کے مطابق ہر وہ شخص جو فاطمی نسل سے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عالم فاضل، زاہد، پارسا اور سخی بھی ہو اور حق کی خاطر ظلم وستم کے خلاف اٹھے اور ظلم وستم کو ختم کرنے کی تحریک چلائے وہ امام ہو سکتا ہے۔

شروع شروع میں زیدی لوگ خود حضرت زید کی طرح پہلے دو خلفاء (حضرت ابوبکر و حضرت عمر) کو اپنے آئمہ میں شمار کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد بعض لوگوں نے ان خلفاء کے نام اپنے اماموں کی فہرست سے نکال دیئے اور اپنی امامت کو حضرت علیؓ سے شمار کرنا شروع کیا۔[1]

تاریخی شہادت کے مطابق فرقہ زیدیہ اصول و اسلام میں "معتزلہ" کا ذوق رکھتا ہے اور تقریباً اسی مذہب کا پیروکار ہے، فروعی اور فقہی عقائد میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرتا ہے جو اہلسنت کے چار اماموں میں سے ایک ہیں۔ ان کے درمیان بعض فقہی مسائل کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف موجود ہے۔[2]

اسمٰعیلیہ شیعہ اور ان کے مختلف فرقے

باطنیہ:۔ امام ششم (حضرت جعفر صادق) کے ایک بیٹے جن کا نام اسمٰعیل تھا اور وہ امام جعفر صادقؒ

---

[1] پاکستان ہندوستان اور کئی دوسرے ممالک میں آج بھی زیدیہ فرقہ کے بعض لوگ پہلے دو خلفائے راشدین کو اپنا خلیفہ مانتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ خود حضرت زید بھی خلفائے راشدین کا احترام کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر زیدی لوگ اپنے آپ کو اہلسنت میں بھی شامل کرتے ہیں اور بعض فقہ حنفیہ کے پیروکار ہیں۔ (مترجم)

[2] یہ مطالب کتاب "ملل والنحل" شہرستانی اور کتاب کامل، ابن اثیر سے ماخوذ کئے گئے ہیں۔

کی اولاد میں سب[1] سے بڑے تھے، انہوں نے اپنے والد کی زندگی میں ہی وفات پائی تھی، حضرت امام جعفر صادقؑ نے اسمٰعیل کی وفات کی گواہی دی اور حتیٰ کہ حاکم مدینہ نے بھی اس گواہی کی تصدیق کی تھی کہ اسمٰعیل فوت ہو چکے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کا ایمان اور اعتقاد تھا کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ غائب اور روپوش ہو گئے ہیں اور اسی لئے دوبارہ ظاہر ہونگے اور وہی مہدی موعود بھی ہوں گے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اسمٰعیل کی وفات کے بارے میں امام ششمؑ کی گواہی ایک قسم کی پردہ پوشی ہے جو جان بوجھ کر عباسی خلیفہ منصور کے خوف سے دی گئی تھی۔ اسی طرح بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اگرچہ اسمٰعیل اپنے والد کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے ہیں لیکن امامت پھر بھی انہی کا حق ہے اور اسمٰعیل کی وفات کے بعد یہ امامت خود بخود ان کے بیٹے محمدؐ کو مل جاتی ہے اور پھر ان کی اولاد میں منتقل ہو گئی ہے۔

پہلے دو فرقوں کے لوگ تو تھوڑے عرصے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے تھے لیکن تیسرا فرقہ ابھی تک باقی ہے اور اس فرقے کے اندر دوسرے کئی فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔

مجموعی طور پر اسمٰعیلیوں کا فلسفہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو ستارہ پرستوں کے فلسفے سے مشابہت رکھتا ہے اور یہ فلسفہ درحقیقت ہندی عرفان اور تصوّف کے ساتھ گھل مل گیا ہے اور اسی طرح قرآنی معارف اور اسلامی احکام کے بارے میں بھی ان کا ایمان ہے کہ ہر ظاہر کے لئے ایک باطن اور ہر باطن کے لئے ایک ظاہر موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہر تنزیل کے لئے ایک تاویل پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اسمٰعیلیوں کا ایمان اور اعتقاد یہ ہے کہ یہ دنیا ہرگز حجّتِ خدا (خدا کے نمائندوں، اولیاء اللہ اور اماموں) سے خالی نہیں ہوتی اور خدا کی حجّت دو طرح کی ہے، ایک ناطق ہے اور دوسری صامت۔ حجّت ناطق تو خود پیغمبر ہوتے ہیں اور حجّت صامت (خاموش) ولی یا امام ہوتے ہیں جو پیغمبرؐ کے جانشین اور وصی ہیں۔ بہرحال حجّت، خدائے تعالیٰ کی ربوبیّت اور خدائی کا مظہر ہے۔

حجّت کی بنیاد ہمیشہ سات (۷) کے عدد کے گرد گھومتی ہے۔ اس طرح کہ ایک نبی یا رسول آتا ہے

---

[1] یہ مطالب، کتب کامل ابن اثیر، روضۃ الصفا، حبیب السیّر، تاریخ ابی الفداء، ملل والنحل شہرستانی اور اس کے بعض اجزا یعنی تاریخ آغا خانیہ سے نقل اور ماخوذ ہیں۔

جس کو کہ خدا کی طرف سے نبوّت (شریعت) اور ولایت ملی ہوتی ہے اور اس کے بعد اس پیغمبر کے سات جانشین ہوتے ہیں جن کو ولایت ملتی ہے۔ ان سب جانشینوں کا ایک ہی درجہ یا مقام ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ ساتواں جانشین نبی بھی ہوتا ہے۔ اس کے تین درجے ہیں یعنی نبوت، جانشینی اور ولایت، اس کے بعد پھر دوبارہ جانشینی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور پہلے کی طرح سات جانشین ہوتے ہیں۔ ساتواں جانشین ان تینوں مقامات اور درجات کا حامل ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی نہج اور طریقے پر چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم نہ ہوگا۔

اسمٰعیلی کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نبوت اور ولایت کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے تھے اور ان کے سات جانشین تھے جن میں سے ساتویں حضرت نوحؑ تھے جن کو نبوت، ولایت اور جانشینی عطا ہوئی تھی، پھر حضرت ابراہیمؑ ساتویں جانشین اور حضرت نوحؑ کے وصی تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے ساتویں جانشین حضرت موسیٰؑ تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتویں جانشین حضرت عیسیٰؑ تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتویں جانشین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ اور اسی طرح حضرت محمدؐ کے ساتویں جانشین محمد بن اسمٰعیل تھے۔ اسی طرح حضرت محمدؐ کے جانشین بالترتیب حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت علی بن حسینؑ (زین العابدین)، حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ، حضرت اسمٰعیل اور حضرت محمد بن اسمٰعیل ہوتے ہیں (یہ لوگ دوسرے امام یعنی حضرت امام حسن بن علیؑ کو اپنا امام نہیں مانتے) محمد بن اسمٰعیل کے بعد ان کی اولاد سے سات افراد جانشین ہیں جن کا نام پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد فاطمی بادشاہوں میں سے پہلے سات افراد جن میں سب سے پہلے عبید اللہ مہدی تھے جو فاطمی سلطنت کے بانی ہوئے جانشین تھے۔

اسمٰعیلیوں کا اعتقاد اور ایمان ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ روئے زمین پر بارہ افراد موجود رہتے ہیں جن کو "حواری یا خواص یا حجّت" کہا جاتا ہے، لیکن اسمٰعیلیوں کے بعض فرقے (دروزیہ یا باطنیہ) ان کی تعداد چھ بتاتے ہیں اور باقی چھ افراد کو اماموں میں سے لیتے ہیں۔

۲۷۸ھ میں (افریقیہ میں عبید اللہ مہدی کے ظہور سے چند سال پہلے) خوزستان کے صوبے میں ایک شخص جس نے اپنا کبھی نام اور پتہ نہیں بتایا تھا، کوفہ کے گرد و نواح میں ظاہر ہوا۔ یہ شخص دن کو روزہ رکھا کرتا تھا اور رات کو عبادت میں گزار دیا کرتا تھا، اپنے ہاتھ سے روزی کما کر کھاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ

عوام کو مذہب اسمٰعیلیہ کی دعوت دیا کرتا تھا۔ اس کی تبلیغ کے ذریعے بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے پیروکاروں میں سے بارہ افراد کو اپنا "نقیب" یعنی مبلّغ کے طور پر منتخب کر لیا تھا اور خود کوفہ سے شام کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا۔

اس ناشناس آدمی کے بعد ایک شخص بنام احمد جو قرمط کے نام سے مشہور ہوا، عراق میں اس کا جانشین بنا، اس نے باطنیہ مذہب کی تبلیغ شروع کی اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے پنجگانہ نماز کے مقابلے میں ایک نئی نماز شروع کی تھی۔ اس نے غسل جنابت کو باطل اور منسوخ کر دیا تھا اور شراب کو حلال اور جائز قرار دیا تھا۔ اسی دوران باطنیہ فرقے کے بعض دوسرے افراد نے بھی اس مذہب کی تبلیغ جاری رکھی اور ایک جماعت کو اپنا گرویدہ اور پیروکار بنا لیا۔

یہ لوگ ان افراد اور اشخاص کے جان و مال کا کچھ احترام نہ کرتے تھے جو باطنیہ فرقے کو نہیں مانتے تھے اور یا اس کے قائل نہیں تھے۔ اس طرح انہوں نے مختلف شہروں یا ملکوں مثلاً عراق، بحرین، یمن اور شامات (آج کل کے شام، لبنان، فلسطین، اسرائیل اور اردن وغیرہ سب علاقے کو شام کہا جاتا تھا) میں اپنی اس تحریک کو مضبوط اور جاری رکھ کر بے اندازہ لوگوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ وہ ان کے مال و متاع کو لوٹ لیا کرتے تھے، انہوں نے بارہا حاجیوں کے قافلوں پر حملے کئے اور ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کے مال اور سامانِ سفر کو لوٹا تھا۔

باطنیہ فرقے کے سرداروں اور سرکردہ لوگوں میں سے ایک شخص ابو طاہر قرمطی تھا، جس نے ۳۱۱ھ میں بصرہ پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کے مال کو لوٹنے اور ان کو قتل کرنے میں ذرا بھر بھی دریغ نہ کیا تھا۔ وہ شخص ۳۱۷ھ میں باطنیہ فرقے کی ایک بہت بڑی فوج لے کر حج کے زمانے میں مکّہ معظمہ گیا اور وہاں کی حکومت کی طرف سے مختصر سی رکاوٹ کو ختم کر کے مکّہ شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے مکّہ معظمہ کے عوام اور تازہ وارد حاجیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا، حتیٰ کہ اس نے مسجد الحرام اور خانہ کعبہ میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اس نے خانہ کعبہ کے پردے کو پھاڑ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر اس نے خانۂ کعبہ کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا اور حجرِ اسود کو خانہ کعبہ کی دیوار سے نکال کر اپنے ساتھ یمن لے گیا جو بائیس سال تک قرمطیوں

کے قبضے میں رہا۔

انہی واقعات اور حوادث کی وجہ سے مسلمانوں نے باطنیہ فرقے سے منہ موڑ لیا اور ان کو دین اسلام سے خارج یعنی کافر سمجھنے لگے، یہاں تک کہ عبیداللہ مہدی فاطمی جو افریقہ (مصر) میں ظاہر ہوا اور اپنے آپ کو مہدی موعود اور اسمٰعیلیوں کا امام کہا کرتا تھا اس نے بھی قرمطیوں سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔

مؤرخین کے بیانات کے مطابق باطنیہ فرقے کا مذہبی تشخص یہ ہے کہ اس فرقے کے افراد ظاہری قوانین اور دینی احکام کی تفسیر باطنی اور روحانی طریقے سے اور ایسے ہی عرفانی تاویل کرتے ہیں اور ظاہری شریعت کو صرف انہی لوگوں سے مختص جانتے ہیں جو کم عقل اور معنوی کمال سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور یہ حکم بعض اوقات ان کے اماموں سے صادر ہوا کرتا ہے۔

نزاریہ، مستعلیہ، دروزیہ اور مقنّعہ فرقے

عبیداللہ مہدی ۲۹۶ھ میں افریقہ میں ظاہر ہوا اور اس نے اسمٰعیلیہ مذہب کے مطابق اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اسی مذہب کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اسی شخص نے ہی فاطمی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کے بعد اس کی اولاد نے مصر کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور سات پشتوں تک کسی دوسرے فرقے کے وجود کے بغیر سلطنت اور اسمٰعیلیہ مذہب کی امامت کی تھی، لیکن اس خاندان کا ساتواں بادشاہ اور امام جس کا نام مستنصر باللہ سعد بن علی تھا، اس کے دو بیٹے نزار اور مستعلی تھے۔ ان دونوں کے درمیان خلافت کے لئے جھگڑا شروع ہو گیا۔ بہت زیادہ کشمکش اور خونی جنگوں کے بعد مستعلی کو فتح ہوئی اور اس نے اپنے بھائی نزار کو پکڑ کر قید کر دیا، یہاں تک کہ اس نے قید میں ہی وفات پائی۔ ان کشمکشوں اور جنگوں کی وجہ سے فاطمیوں کے پیروکار دو فرقوں یا گروہوں میں بٹ گئے: "نزاریہ" اور "مستعلیہ"۔

نزاریہ فرقہ بعد میں حسن بن صباح کا پیروکار بن گیا جو مستنصر باللہ کا نزدیکی اور مقرب تھا۔ چونکہ حسن بن صباح، مستنصر باللہ کے بعد نزار کا جانبدار تھا اس لئے مستعلی کے حکم سے اس کو مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ایران چلا گیا اور تھوڑی مدّت کے بعد وہ قزوین کے علاقے میں واقع قلعہ "الموت" میں چلا گیا۔

اس نے ایک فوج تیار کر کے قلعہ الموت اور چند دوسرے گرد و نواح کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا۔ اس نے نزار کے حق میں تبلیغ جاری رکھی۔ حسن بن صباح کے مرنے یعنی ۵۱۸ھ کے بعد "بزرگ امید رودباری" اور اس کے بعد اس کے بیٹے "کیا محمد" نے حسن بن صباح کے طریقے اور آئین پر ہی حکومت کی تھی۔ پھر اس کا بیٹا "حسن علی ذکرہ اسلام" جو الموت کا چوتھا حکمران اور والی تھا، اس نے حسن بن صباح کے نزاری آئین اور طریقے کو منسوخ کر دیا اور باطنیہ فرقے کی پیروی شروع کر دی تھی۔

یہاں تک کہ ہلاکو خان تاتار نے ایران پر حملہ کر دیا اور اس نے اسمٰعیلیہ قلعوں کو فتح کر کے تمام اسمٰعیلیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس نے قلعوں کی بڑی بڑی فلک بوس عمارتوں کو بھی خاک کے ساتھ یکساں کر دیا۔ اس کے بعد ۱۲۵۵ھ میں آغا خان محلاتی نے جو نزاریہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا ایران میں محمد شاہ قاچار سے بغاوت کی اور اس نے کرمان کے علاقے میں جو تحریک شروع کی تھی اس میں اسے شکست ہوئی اور وہ بمبئی کی طرف بھاگ گیا۔ اس نے وہاں باطنیہ نزاری فرقے کی تبلیغ کا کام جاری رکھا اور اپنی امامت کا اعلان کر دیا۔ اس فرقے کی تبلیغ ابھی تک باقی اور جاری ہے۔ اور نزاریہ فرقہ کو اب "آغا خانیہ" کہا جاتا ہے۔

مستعلیہ :- اس فرقے کے لوگ فاطمی بادشاہ مستعلی کے مرید یا پیروکار تھے اور ان کی امامت مصر کے فاطمی خلفاء میں ہی باقی رہی جو ۵۵۷ھ میں ختم ہو گئی لیکن کچھ عرصہ بعد ہندوستان اور پاکستان میں "بوہرہ فرقہ" کی بنیاد اسی مذہب پر دوبارہ قائم ہوئی جو اب بھی باقی اور جاری ہے۔

دروزیہ :- دروزیہ قبیلہ جو دروز (شام) کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہے، اس قبیلے کے لوگ ابتدا میں فاطمی خلفاء کے پیروکار تھے لیکن چھٹے فاطمی خلیفہ کے زمانے میں نشتگین دروزی کی تبلیغات کے زیر اثر باطنیہ فرقے سے ملحق ہو گئے۔ دروزیہ فرقے کی امامت الحاکم باللہ (فاطمی بادشاہ) پر آ کر رک گئی جو دوسروں کے اعتقاد کے مطابق قتل ہو گیا تھا لیکن دروزیہ فرقے کا عقیدہ یا خیال ہے کہ وہ غائب ہو گیا ہے اور آسمانوں پر چلا گیا ہے اور پھر دوبارہ لوگوں کے درمیان آئے گا

(یعنی وہی امام مہدی کی شکل میں ظہور کرے گا)

مقنّعہ:۔ اس فرقے کے لوگ شروع میں "عطا مروی المعروف بہ مقنّع" کے پیروکار تھے جو مورخین کے قول کے مطابق ابومسلم خراسانی کے مریدوں اور پیروکاروں میں سے تھا۔ اس نے ابومسلم کی وفات کے بعد دعویٰ کیا کہ ابومسلم کی روح اس کے اندر حلول کر گئی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے پیغمبری کا دعویٰ بھی کر دیا لیکن اس نے اسی پر ہی قناعت نہیں کی اور آخر کار اس نے خدائی کا دعویٰ بھی کر دیا مگر آخر الامر ۱۶۲ھ میں عباسی خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) نے ماوراء النہر کے علاقے میں قلعہ کیش کا محاصرہ کر لیا جب مقنع کو اپنی گرفتاری اور موت کا یقین ہو گیا تو اس نے آگ جلائی اور اپنے چند ایک پیروکاروں کے ساتھ اس میں کود گیا[1] اور جل کر خاکستر ہو گیا۔ عطا مروی (مقنع) کے پیروکاروں نے کچھ عرصے کے بعد اسمٰعیلیہ مذہب اختیار کر لیا اور پھر باطنیہ فرقہ کے ساتھ ملحق ہو گئے۔

بارہ امامی شیعہ اور ان کا زیدیہ و اسمٰعیلیہ کے ساتھ فرق

شیعوں کی اکثریت جس میں سے تمام مذکورہ فرقے، گروہ اور اقلیتیں نکلی اور جدا ہوئی ہیں ان کو بارہ امامی یا اثنا عشری یا شیعہ امامیہ کہتے ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس مذہب کی پیدائش کی وجہ شروع میں ہی اسلامی مسائل میں سے دو بنیادی اصولوں اور مسئلوں کے بارے میں اختلافِ نظر تھا اور یہ مذہب انہی دو اصولوں میں اعتراض کے طور پر پیدا ہوا تھا لیکن اس فرقے میں حضرت رسول اکرمؐ کی تعلیمات کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا اور نہ ہی ان کو اسلامی قانون کے متعلق کوئی اعتراض تھا، وہ دو مسائل یہ ہیں یعنی "اسلامی حکومت" اور علمی رہبری (قیادت) کہ شیعہ ان کو اہلبیتؑ کا خصوصی

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ تیزاب سے بھرے ہوئے حوض میں کود پڑا تھا اس طرح اس کا بدن اور ہڈیاں تیزاب میں حل ہو گئی تھیں پھر جب قلعہ فتح ہو گیا تو اس (مقنع) کی تلاش ہوئی تو نہ وہ خود اور نہ ہی اس کی لاش دستیاب ہو سکی، تو اس کے ماننے والوں کو یقین ہو گیا وہی حقیقی خدا تھا اور آسمانوں پر چلا گیا ہے، ورنہ اس کی لاش ضرور مل جاتی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے معجزے (ماہ نخشب) کے ذریعے لوگوں کو اپنے خدائی دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ (مترجم)

حق سمجھتے ہیں۔

شیعہ کہتے ہیں "اسلامی خلافت کہ معنوی اور باطنی ولایت یا دینی رہبری اس کا جزو لاینفک ہے، حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا حق ہے جو پیغمبر اکرمؐ کے واضح اعلان کے مطابق اہلبیتؑ کے امام ہیں، جن کی تعداد بارہ ہے اور پھر کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی ظاہری تعلیمات جن کو احکام، قوانین اور شریعت کہا جاتا ہے مکمل ضابطہ حیات بھی ہے اور اپنی معنوی اصلیت کے اعتبار سے بھی مکمل ہے اور قیامت کے دن تک باطل اور منسوخ نہیں ہوگی۔ ان اسلامی قوانین و احکام کو صرف اہلبیتؑ ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور بس، لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ:

بارہ امامی شیعہ اور زیدیہ فرقہ کے درمیان کلی طور پر فرق یہ ہے کہ زیدی شیعہ اغلب امامت کو اہلبیتؑ سے مخصوص نہیں جانتے اور اماموں کی تعداد کو بارہ (۱۲) پر منحصر و محدود نہیں کرتے اور اہلبیتؑ کی فقہ کی پیروی بھی نہیں کرتے جو بارہ امامی شیعوں کے بالکل برعکس اور مخالف ہے۔ اس طرح بارہ امامی شیعہ اور اسمٰعیلی شیعہ کے درمیان مجموعی طور پر فرق یہ ہے کہ اسمٰعیلیہ فرقے کا اعتقاد یہ ہے کہ امامت سات (۷) کے عدد کے گرد گھومتی ہے اور نبوت حضرت محمدؐ پر ختم نہیں ہوئی ہے اور احکام شریعت میں تغیّر و تبدّل بلکہ اصل فرائض کو ختم کردیا یا چھوڑ دینا، خصوصاً باطنیہ فرقہ کے قول کے مطابق کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن اس کے برعکس شیعہ اثنا عشری یا بارہ امامی جو حضرت محمدؐ کو خاتم الانبیاء جانتے ہیں اور آپؐ کے بعد بارہ (۱۲) جانشینوں اور اماموں پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح ظاہری شریعت کو معتبر اور ناقابلِ منسوخ اور ناقابل تبدیل سمجھتے ہیں اور قرآن مجید کے لئے ظاہری اور باطنی معنوں پر مکمل یقین اور ایمان رکھتے ہیں۔

خاتمۂ باب

آخری دو صدیوں کے دوران بارہ امامی شیعہ میں سے دو دوسرے فرقے بنام "شیخیہ اور کریم خانیہ" پیدا ہوگئے ہیں۔ اگرچہ بعض مسائل میں دوسرے فرقوں کے ساتھ ان کا اختلاف ہے لیکن یہ

اختلاف صرف فقہی مسائل میں ہے نہ کہ نفی اور اثبات کے اصلی مسائل میں لہٰذا ہم ان کو اصل فرقے نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ایک فرقہ "علی الٰہی" کے نام سے بھی موجود ہے جو بارہ امامی شیعہ سے جدا اور الگ ہوا ہے۔ اس فرقے کو "غلاۃ" (غلو کرنے والا، مبالغہ کرنے والا) کہا جاتا ہے اور باطنیہ اور اسمٰعیلیہ کی طرح یہ فرقہ بھی صرف باطن پر ایمان رکھتا ہے، اور چونکہ اس فرقے کے پاس کوئی منظّم اور مرتب منطق موجود نہیں ہے اس لئے ہم اس فرقے کو شیعہ فرقوں میں شمار ہی نہیں کرتے۔

بارہ امامی شیعہ کی تاریخ کا خلاصہ

جیسا کہ پہلے ابواب میں واضح کیا جا چکا ہے کہ شیعوں کی اکثریت بارہ امامی شیعہ پر منحصر تھی۔ یہ وہی جماعت تھی جو حضرت علیؑ کی پیروکار اور جانبدار تھی اور جس نے حضرت پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد اہلبیتؑ کے حقوق کی بحالی اور خصوصاً خلافت اور دینی رہبری کے بارے میں اعتراضات کئے تھے، اور اس کے بعد اکثریتی جماعت (اہلسنت) سے الگ ہو گئی تھی۔

شیعہ، خلفائے راشدین (۱۱ھ تا ۳۵ھ) کے زمانے میں ہمیشہ سیاسی دباؤ کے زیر اثر رہے اور اس کے بعد بنو امیّہ کی خلافت کے زمانے (۴۰ھ تا ۱۳۲ھ) میں وہ جان و مال کی حفاظت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ لیکن جس قدر بھی ان پر ظلم و ستم اور سیاسی دباؤ زیادہ بڑھتا جاتا تھا، وہ اپنے عقیدے اور ایمان میں زیادہ سے زیادہ پختہ ہوتے جاتے تھے۔ خصوصاً اپنی مظلومیّت اور محرومیّت کی وجہ سے اپنے عقیدے اور نظریئے کی وسعت اور ترقی میں زیادہ کوشش اور جدوجہد کرتے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے وسط میں جبکہ خلفائے عباسی نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو شیعوں نے اس زمانے کی ہرج و مرج اور بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر کچھ امن و آرام کا سانس لیا مگر اس عارضی مدت اور مہلت کے بعد دوبارہ ان پر سختی شروع ہو گئی اور یہ سختی تیسری صدی ہجری کے آخر تک روز بروز بڑھتی ہی رہی۔

چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں جب آلِ بویہ کے شیعہ حکمرانوں نے سلطنت شروع کی اور عنانِ اقتدار سنبھالی تو اس وقت شیعوں نے بھی طاقت حاصل کرلی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو بہت کافی زیادہ آزادی مل گئی تھی، لہٰذا انہوں نے اعلانیہ طور پر اپنے مخالفوں کا مقابلہ شروع کردیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری تک حالات اسی طرح جاری رہے۔ چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں مغلوں (تاتاریوں) کے حملے شروع ہوگئے جن کی وجہ سے ایران میں عام مصیبت پیدا ہوگئی اور دوسری طرف صلیبی جنگوں کے شروع ہو جانے کے سبب اسلامی حکومتیں شیعوں پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتی تھیں اور خصوصاً بعض مغل سلاطین کے مذہب شیعہ اختیار کرلینے کی وجہ سے، اور اسی طرح مازندران کے علاقے میں مرعشی سلاطین کی حکومت کے سبب شیعوں کی ترقی اور وسعت میں بہت زیادہ مدد ملی۔ اس طرح تمام اسلامی ممالک کے کونے کونے میں اور خاص کر ایران میں شیعوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ محسوس ہونے لگا۔ نویں صدی ہجری تک یہی حالت قائم رہی اور تقریباً دسویں صدی ہجری کے شروع میں ایران میں صفوی حکومت کے ظہور سے مذہب شیعہ نے سرکاری مذہب کی کی حیثیت اختیار کرلی اور اب چودھویں صدی ہجری (یعنی آج تک) یہ مذہب سرکاری مذہب کے طور پر باقی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف اسلامی ملکوں میں بھی کروڑوں کی تعداد میں شیعہ زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا حصہ

شیعوں کا علمی تفکّر

- مذہبی تفکّر کے معنی۔
- اسلام میں مذہبی تفکّر کے بنیادی معنی۔
- تین طریقے جن کی طرف قرآن کریم مذہبی تفکّر کے لئے رہنمائی کرتا ہے۔
- تینوں طریقوں کے درمیان فرق۔
- پہلا طریقہ، دینی ظواہر، دینی ظواہر کی اقسام، قرآن مجید، پیغمبر اکرمؐ اور اہلبیتؑ کی احادیث۔
- صحابہ کی احادیث
- کتاب وسنّت کے بارے میں دوبارہ بحث۔
- قرآن مجید کا ظاہر اور باطن۔
- قرآن مجید کی تاویل۔
- حدیث کی بحث کا تتمہ۔
- حدیث پر عمل کے بارے میں شیعوں کا طریقہ۔
- اسلام میں عام تعلیم وتعلّم۔
- شیعہ اور نقلی علوم۔

مذہبی تفکّر کے معنی

مذہبی تفکّر اس بحث وجستجو اور تلاش میں غور وخوض کرنے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے مذہب کے اصولوں اور مذہبی مواد میں سے ایک اصل یا مادّہ کے بارے میں مذہبی تعلیم سے نتیجہ اخذ کیا جا سکے جیسا کہ علم ریاضی میں تفکّر، اس سوچ اور غور کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ریاضی کے ایک مسئلے یا نظریئے کے متعلق حل تلاش کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

اسلام میں مذہبی تفکّر کے بنیادی مآخذ

البتہ مذہبی تفکّر کے لئے بھی دوسرے تمام تفکّرات کی طرح مآخذ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کیونکہ فکری مواد انہی سے پیدا ہوتا ہے اور انہی پر تکیہ کرتا ہے جیساکہ ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے کے لئے تفکّر میں معلومات کے تسلسل کو ذہن میں لانا پڑتا ہے جو آخر کار ایک نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔ صرف ایک ماخذ جس پر آسمانی دین اسلام تکیہ کرتا ہے (اس لحاظ سے کہ یہ دین آسمانی وحی تک پہنچتا ہے) قرآن مجید ہی ہے اور قرآن مجید، پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور رسالت کی ہمیشگی، عمومی اور قطعی دستاویز ہے۔ اس آسمانی کتاب میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ اسلامی دعوت یا دین کہلاتا ہے، البتہ قرآن کریم کے واحد اور اکیلے ماخذ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تفکّر کے دوسرے صحیح منابع و ماخذ اور دلائل کو باطل یا منسوخ سمجھا جائے جیساکہ ہم اگلے صفحات میں تفصیلاً بیان کرینگے۔

تین طریقے جن کی طرف قرآن مجید مذہبی تفکّر کیلئے رہنمائی کرتا ہے

قرآن کریم اپنی تعلیمات میں معارف اسلامی اور مقاصد دینی کو سمجھنے اور ان تک پہنچنے کے لئے اپنے پیروکاروں کے سامنے تین طریقے رکھتا ہے، اور یہ تین راستے ان کو دکھاتا ہے:-

۱۔ ظواہر دینی (شریعت) ۲۔ عقلی حجّت اور

۳۔ معنوی پہچان (شریعت، طریقت اور حقیقت) بندگی اور اخلاص کے ذریعے۔

اس کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ قرآن کریم اپنے بیانات میں سب انسانوں کو مخاطب کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنے قول کے مطابق کسی دلیل، حجّت اور برہان کے بغیر صرف خداوند تعالیٰ کی فرمان روائی اور حکومت کو قبول کرنے، اعتقادی اصول مثلاً توحید، نبوت اور معاد کو ماننے اور اسی طرح عملی احکام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو تسلیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اعمال اور کاموں سے منع فرماتا ہے۔ قرآن مجید اگر ان لفظی بیانات کی دلیل نہ رکھتا تو ہرگز لوگوں کو فرمان برداری اور اس کے قبول کرنے کا حکم کبھی نہ دیتا، پس

ناگزیر یوں کہنا چاہئے کہ قرآن مجید کے ایسے سادہ بیانات، مقاصد دینی اور معارف اسلامی کو سمجھنے کے لئے ایک ماخذ یا طریقے کا کام دیتے ہیں۔ ہم نقطی بیانات مثلاً 'امنوا باللہ ورسولہ اور اقیموا الصلوٰۃ کو دینی ظواہر کہتے ہیں۔

اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اپنی بہت زیادہ آیات میں عقلی حجّت (دلیل و برہان یا عقلی دلائل) کی طرف رہبری و راہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو انفس و آفاق کی نشانیوں میں غور و خوض کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خود بھی حقائق کو واضح کرنے کے لئے عقلی دلائل اور استدلال کو بیان کرتا ہے، حقیقت میں دوسری کوئی آسمانی کتاب قرآن کریم کی طرح اس قدر دلائلی علم و معرفت کو انسان کے لئے فراہم نہیں کرتی۔

قرآن مجید اپنے بیانات کے ذریعے عقلی حجّت اور آزاد دلائلی استدلال (منطق) کو مسلّم سمجھتا ہے یعنی یہ نہیں کہتا کہ سب سے پہلے معارف اسلامی کی حقانیّت کو قبول کرو اور پھر عقلی دلائل میں غور کر کے مذکورہ معارف اور علوم کو اس میں سے اخذ کرو، بلکہ اپنی واقعیّت اور حقیقت پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے فرماتا ہے کہ عقلی دلائل کو سمجھتے ہوئے مذکورہ علوم اور معارف کی حقانیت پر غور کرو اور پھر اسے قبول کرو اور وہ دعویٰ اور باتیں جو تم اسلامی تحریک (دینِ اسلام) سے سنتے ہو، تم ان کی تصدیق آفرینش جہان (دنیا کی حقیقت اور فطرت) سے کرو جو سچی اور حقیقی گواہی ہے اور پھر سند اور آخر کار صدق و ایمان کو اپنے غور و خوض اور دلائل کے نتیجے کے ذریعے حاصل کرو، نہ یہ کہ پہلے ایمان لے آؤ اور پھر اس کے مطابق دلائل لاؤ۔ پس فلسفی تفکّر ایک ایسا طریقہ ہے جس کی موجودگی کی قرآن کریم تصدیق کرتا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم بہت ہی دلچسپ اور واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ دنیا کے سارے حقیقی علوم و معارف، توحید اور حقیقی خداشناسی سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں اور خداشناسی میں کمال صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرف سے اکٹھا کر کے صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اور ہر چیز کو بھول کر صرف اپنی بندگی اور اخلاص کی وجہ سے فقط عالم بالا (خدا تعالیٰ)

کی طرف مبذول کرلی ہے اور خداوند عزّوجل کے نور سے ان کی آنکھیں منوّر اور پرنور ہو چکی ہیں انہوں نے اپنی حقیقت بین آنکھوں سے اشیاء کی حقیقت، آسمانی فرشتوں اور زمین کی واقعیت کو دیکھ لیا ہے، کیونکہ اخلاص اور بندگی کے ذریعے وہ عین الیقین تک پہنچ چکے ہیں اور اسی یقین وایمان کی وجہ سے ان کے سامنے عالم ملکوت، آسمان، زمین ہمیشہ کی زندگی اور ابدی دنیا کی حقیقت آشکار اور بے پردہ ہو گئی ہے۔

ان آیات کریمہ میں توجہ کرنے سے یہ دعویٰ مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے :-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ [1] (سورہ انبیاء آیہ ۲۵)

ترجمہ: اور (اے رسولؐ) ہم نے تم سے پہلے جب کبھی کوئی رسول بھیجا تو اس کے پاس ہم یہی وحی بھیجتے رہے کہ بس ہمارے سوا کوئی معبود قابلِ پرستش نہیں تو میری عبادت کیا کرو۔

اور پھر فرماتا ہے :

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ [2] (الصّٰفّٰت ۱۵۹، ۱۶۰)

ترجمہ: یہ لوگ جو باتیں بنایا کرتے ہیں ان سے خدا پاک صاف ہے مگر وہ لوگ جو خدا کے برگزیدہ اور خالص ہیں۔

اور پھر فرماتا ہے :-

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ [3] (سورہ مریم آیت ۱۱۰)

---

[1] اس آیہ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ دین خدا میں عبادات توحید کی ایک شاخ ہے۔ یہ عبادات اسی توحید کی بنیاد پر واقع ہیں۔

[2] فرع کی توصیف و تعریف سے "سمجھنا" اور اس آیہ کریمہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے پاک اور مخلص بندوں کے علاوہ کوئی شخص بھی خدائے تعالیٰ کو جیسا کہ پہچاننا چاہیئے، نہیں پہچان سکتا اور خدا تعالیٰ دوسروں کی عبادت سے بے نیاز ہے۔

[3] اس آیہ کریمہ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حق کو دیکھنے اور اس تک پہنچنے کے لئے توحید اور نیک اعمال کے بغیر کوئی راہ ممکن نہیں ہے۔

ترجمہ: اے نبیؐ کہدو کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں لیکن مجھے تمہارے خدا کی طرف سے وحی بھیجی جاتی ہے اور تمہارا خدا ایک ہے پس جو کوئی خدا کی ملاقات کا امیدوار ہے اس کو نیک کام کرنے چاہیں اور خدائے وحدہٗ لاشریک کے ساتھ عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائے

پھر فرماتا ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ○ [1] (سورہ حجر آیت ۹۹)

ترجمہ: اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو یہاں تک کہ تم یقین (عین الیقین) تک پہنچ جاؤ۔

اور پھر فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ [2]

ترجمہ: اور اسی طرح ہم (اپنے پیغمبر) ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والے لوگوں میں سے ہو (اس کو یقین ہو جائے اور اس کا ایمان مزید پختہ ہو جائے) (سورہ انعام آیہ ۷۵)

اور پھر فرماتا ہے:

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ○ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ○ (سورۃ تطفیف آیت ۱۸-۲۱) [3]

ترجمہ: حقا کہ بے شک نیکو کار لوگوں کا تقدیر نامہ علیین میں لکھا ہوا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ علیین کیا چیز ہے۔ علیین ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی گواہی مقربانِ درگاہِ خدا دیتے ہیں۔

اور پھر فرماتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ○ (سورۃ تکاثر آیت ۵-۶)

---

[1] اس آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حنیفی عبادت اور پرستش خدا پر یقین کا نتیجہ ہے۔

[2] اس آیہ کریمہ کا مطلب یوں ہے کہ یقین کے لوازمات میں سے ایک آسمانوں اور زمین دنیا کا مشاہدہ ہے۔

[3] آیات سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ نیک بندوں کی تقدیر ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے جس کا نام "علیین" (بہت بلند) ہے کہ خدا کے مقرب بندے ہی اسکو دیکھ سکتے ہیں اور اسی طرح لفظ یشھدہ سے واضح ہے کہ یہ کتاب لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب عالم تقرب اور ترقی و تکمیل ہے۔

ترجمہ: ہرگز نہیں، کیا تم جانتے ہو کہ علم الیقین کیا ہے؟ البتہ یہ اس وقت معلوم ہوگا جب تم دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ [1]

پس خدائی معارف کو سمجھنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ پاکی نفس اور بندگی میں اخلاص ہے۔

ان تین طریقوں کے درمیان فرق

پچھلے بیان سے واضح ہوگیا ہے کہ قرآن مجید، دینی معارف اور مفاہیم کو سمجھنے کے لئے تین طریقے پیش کرتا ہے، ظواہر دینی (شریعت) اور بندگی میں عقل و اخلاص، حقائق اور باطنی مشاہدات کے موجب ہیں، لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ تین طریقے چند لحاظ سے باہم فرق رکھتے ہیں۔

پہلا، "ظواہر دینی"، چونکہ ایسے لفظی بیانات ہیں جو سادہ ترین الفاظ اور بیان میں بتائے گئے ہیں اور ان کو لوگوں کی دسترس اور اختیار میں دیا گیا ہے اور ہر شخص اپنے فہم و عقل کے مطابق ان سے بہرہ مند ہوتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے [2] یعنی دوسرے دو طریقوں کے بالکل برعکس جو ایک خاص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور عمومی نہیں ہیں۔

دوسرا، ظواہر دینی کا طریقہ وہ طریقہ ہے جس پر چل کر اصولِ دینی، فروعات اور اسلامی معارف کو پہچان کر ایمانی اور عملی دعوت (اصولِ معارف اور اخلاق) تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، دوسرے دو طریقوں کے بالکل برخلاف، کیونکہ اگرچہ عقل کے ذریعے، اعتقادی، اخلاقی اور عملی مسائل کے کلیات کو سمجھا جاسکتا ہے لیکن احکام (شریعت) کی جزئیات چونکہ خاص مصلحتوں کی بناء پر عقل کی دسترس میں نہیں دی گئی ہیں لہٰذا اس کے دائرہ عمل سے خارج ہیں اور اسی طرح تہذیبِ نفس کا طریقہ ہے۔

---

[1] اس آیۂ کریمہ سے یوں سمجھ آتا ہے کہ علم الیقین ظالم و ستمگار لوگوں کے انجام اور آخرت کے مشاہدے سے ہوگا جس کو جہنم کہا گیا ہے (یعنی جب ان کو جہنم میں دیکھو گے تو تمہیں یقین آجائے گا)

[2] یہی وجہ ہے کہ پیغمبرؐ خدا نے اپنی ایک حدیث میں جس کو عام و خاص نے نقل کیا ہے فرمایا ہے کہ پیغمبروں کی جماعت لوگوں کے ساتھ ان کی عقل و دانش کے مطابق بات کرتی ہے۔ (بحار الانوار جلد اول صفحہ ۳۷۔ اصول کافی جلد اول صفحہ ۲۰۳)

چونکہ اس کا نتیجہ حقائق کے انکشاف پر مبنی ہے اور وہ ایسا علم ہے جو خداداد ہے اس لئے اس کے نتیجے اور اس سے حاصلہ حقائق کے لئے جو اس خدائی عنایت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی یا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ چونکہ ہر چیز سے الگ ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا انہوں نے ہر چیز کو فراموش کر دیا ہے لہٰذا وہ براہ راست خدا کی ولایت اور سرپرستی کے دائرے میں چلے جاتے ہیں، پس خدا کی مرضی اور عنایت سے (نہ کہ ان کو اپنی مرضی سے) ہر چیز ان پر منکشف اور ظاہر و واضح ہو جاتی ہے۔

پہلا طریقہ۔ ظواہر دینی اور ان کی اقسام

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید جو اسلام کے بنیادی مذہبی تفکّر کا ماخذ ہے، اپنے ظاہری الفاظ کے ذریعے اپنے قارئین اور سامعین کے سامنے حجت (برہان) پیش کرتا ہے اور یہی ظاہری آیات پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کو دوسرے درجے پر رکھتی ہیں اور وہ بھی قرآن مجید کی طرح حجت (دلیل و برہان) لاتی ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورہ نحل آیہ ۴۴)

ترجمہ: اور ہم نے تجھ پر ذکر (کتاب) نازل کیا تاکہ جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو۔

پھر فرماتا ہے: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ جمعہ آیت ۲)

ترجمہ: وہ (خدا) جس نے مکّہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسولؐ بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت (دانش و علم) سکھاتا ہے۔

اور پھر فرماتا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ احزاب آیت ۲۱)

ترجمہ: بیشک تمہارے لئے رسولِ خدا کی اقتدا اور پیروی لازمی اور ضروری ہے۔

پس معلوم اور واضح ہے کہ اگر پیغمبر اکرمؐ کے گفتار و اعمال اور حتیٰ کہ آپؐ کی خاموشی اور دستخط ہمارے لئے قرآن کی طرح حجت اور دلیل نہ ہوتے تو مذکورہ مفہوم اور مطلب بھی ٹھیک نہ ہوتا۔ پس پیغمبر اکرمؐ کا بیان ان لوگوں کے لئے جنہوں نے خود آپؐ سے سنا یا قابل اعتماد ذرائع سے ان تک پہنچا ہے،

لازم الاتباع ہے (یعنی اس بیان کی اطاعت، پیروی اور پابندی لازمی ہے) اور اسی طرح آنحضرتؐ کے یہ بیانات قطعی تواتر احادیث[1] کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں، یعنی آپؐ کے اہلبیتؑ کے بیانات بھی پیغمبر اکرمؐ کے بیانات کے بعد قابل اعتماد اور معتبر ہیں اور اہلبیت علیہم السلام علمی رہبری رکھتے ہیں کیونکہ وہ اسلامی معارف اور احکام کے بیان میں ہرگز خطا اور غلطی نہیں کرتے، لہٰذا ان کے بیانات خواہ وہ زبانی ہوں یا لکھے ہوئے ہوں (البتہ قابل اعتماد ذرائع سے) حجت، دلیل اور برہان ہیں۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظواہر دینی جو اسلامی تفکّر میں ایک سند اور دستاویز ہے دو اقسام پر مشتمل ہے "کتاب اور سنّت" کتاب سے مراد قرآنی آیات کے ظاہری معنی ہیں اور سنّت سے مراد پیغمبر اکرمؐ اور اہلبیتؑ کی احادیث ہیں جو ہم تک صحیح ذرائع سے پہنچی ہیں۔

صحابہ کی احادیث

لیکن وہ احادیث جو صحابہ کے ذریعے لکھی گئی یا نقل ہوئی ہیں، اگر وہ پیغمبر اکرمؐ کے قول و فعل کے مطابق ہوں اور اہلبیتؑ سے روایت شدہ احادیث کے بھی مخالف نہ ہوں تو قابل قبول ہیں۔ اور اگر خود صحابی کی نظر اور رائے کے مطابق ہوں تو وہ حجت و برہان نہ ہوں گی (قابل قبول نہ ہوں گی) اور صحابہ کا حکم بھی دوسرے تمام مسلمانوں کے برابر اور مانند ہے۔ خود اصحاب رسولؐ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک عام مسلمان کی طرح سلوک کیا کرتے تھے۔

کتاب و سنت کے بارے میں دوبارہ بحث

کتاب خدا (قرآن مجید) ہر قسم کے اسلامی تفکّر کا بنیادی ماخذ ہے، اور یہ قرآن کریم ہی ہے جو دوسرے تمام دینی ماخذ کے ثبوت کو اعتبار بخشتا ہے اور ان کے معتبر ہونے کی سند دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سب کے لئے قابل فہم ہے۔

---

[1] احادیث کی دستاویز پہلے حصے میں آچکی ہے۔

اس کے علاوہ خود قرآن مجید اپنے آپ کو "نور" اور ہر چیز کو واضح کرنے والا بتاتا ہے اور چیلنج کرتے ہوئے لوگوں سے درخواست کرتا ہے کہ قرآنی آیات میں غور و خوض اور فکر کریں کہ اس کی آیات میں کسی قسم کا اختلاف اور تضاد موجود نہیں ہے اور اگر نہیں مانتے تو اس کی مانند کتاب لکھ کر لائیں اور اس کے ساتھ مقابلہ و معارضہ کریں۔ واضح رہے کہ اگر قرآن مجید سب لوگوں کے لئے قابل فہم نہ ہوتا تو اس قسم کی حقانیّت کے کوئی معنیٰ ہی نہ ہوتے۔

البتہ ہرگز یوں نہیں سمجھنا چاہئے کہ قرآن مجید جو خود بخود قابلِ فہم ہے اور گزشتہ مطلب کے منافی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام اسلامی معارف اور علوم میں علمی مراجع (دینی اور علمی رہبر) ہیں اور وہ خود درحقیقت قرآن کریم کے مضامین میں سے ہیں کیونکہ بعض معارف اور علوم جن کو شریعت کے احکام اور قوانین کہا جاتا ہے، قرآن مجید ان کو مجموعی اور کلّی طور پر بیان کرتا ہے لیکن ان کی تفصیلات کو جاننے کے لئے مانند نماز، روزہ وغیرہ اور اسی طرح لین دین اور دوسری عبادات وغیرہ سنّت پیغمبرؐ اور اہلبیتؑ کی احادیث کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوتے ہیں اور یہ امور و احکام انہی پر موقوف ہیں۔

اسلام کا دوسرا حصہ جو اعتقادی اور اخلاقی تعلیمات اور اسی طرح معارف اسلامی پر مشتمل ہے اگرچہ ان کے مضامین اور تفصیلات عام افراد کے لئے قابل فہم ہیں لیکن ان کے معانی سمجھنے کے لئے اہلبیتؑ کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ اسی طرح ہر قرآنی آیات کو اس کی دوسری آیات کے ساتھ ملا کر معنیٰ، توضیح اور تفسیر کرنی چاہئے نہ کہ اپنے نظریئے اور خیالات کے مطابق جیسا کہ ہمارے زمانے میں یہ رسم اور عادت عام ہو چکی ہے اور ہم بھی اس طریقے سے مانوس ہو چکے ہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں[1]: "قرآن مجید کی بعض آیات، بعض دوسری آیات کے ذریعے واضح ہوتی ہیں اور معنیٰ دیتی ہیں، اور اس کی بعض آیات، بعض دوسری آیات کے متعلق گواہی دیتی ہیں اور ان کی تصدیق کرتی ہیں"۔ اور پیغمبر اکرمؐ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۳ (اسلام میں قرآن) کے فٹ نوٹ میں بھی موجود ہے۔

فرماتے ہیں[۱]: "قرآن مجید کے بعض حصّے بعض دوسرے حصّوں کی تصدیق کرتے ہیں"۔ اور پھر فرماتے ہیں[۲]: "جو شخص قرآن مجید کی تفسیر صرف اپنے نظریئے اور اپنی رائے کے مطابق کرے گا وہ اپنے لئے جہنم میں ٹھکانہ بنائے گا"۔

قرآن سے قرآن کی تفسیر کے لئے ایک بہت ہی سادہ سی مثال وہ ہے جو خدا تعالیٰ قوم لوط کے عذاب کی داستان میں ایک جگہ فرماتا ہے: "ہم ان پر بری بارش کریں[۳] گے"۔ اور ایک دوسری جگہ اسی لفظ کو ایک دوسرے لفظ کے ساتھ بدل دیتا ہے اور فرماتا ہے "ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں گے"۔[۴] ان دو آیات کے انضمام سے واضح ہو جاتا ہے کہ بری بارش کا مطلب "آسمانی پتھر ہے"۔ اگر کوئی شخص تحقیق و جستجو کے ساتھ اہلبیتؑ کی احادیث اور ان روایات سے جو مفسّرین صحابہ اور تابعین سے ہم تک پہنچی ہیں، ان کے اندر معنی تلاش کرے تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا کہ قرآن سے قرآن کی تفسیر کا طریقہ صرف اہلبیتؑ سے ہی مختص ہے۔

قرآن مجید کا ظاہر اور باطن

جیسا کہ ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم اپنے لفظی بیان کے ساتھ دینی مقاصد اور مطالب کو واضح کرتا ہے، اور لوگوں کو اعتقاد، ایمان اور عمل کے بارے میں احکام دیتا ہے، لیکن قرآن مجید کے مقاصد صرف اسی مرحلے پر منحصر یا ختم نہیں ہوتے بلکہ انہی الفاظ و عبارات کے اندر اور انہی مقاصد کے پردے میں ایک معنوی مرحلہ اور کئی دوسرے گہرے مقاصد اپنی بے انتہا وسعتوں کے ساتھ چھپے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اپنے پاک دلوں کے ساتھ ان کو سمجھ سکتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ جو قرآن مجید کے خدائی معلم ہیں فرماتے ہیں[۵]: "قرآن مجید کا ظاہر بہت ہی خوش

۱۔ درالمنثور جلد ۲ صفحہ ۶۔ ۲۔ تفسیر صافی صفحہ ۸ ۔ بحارالانوار جلد ۱۹ صفحہ ۲۸۔

۳۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (سورہ شعرا۔ آیت ۱۷۳) اور ہم نے ان پر بہت بری بارش برسائی۔

۴۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (سورہ حجر آیہ ۷۴) پس ہم نے شہروں کو زیر و زبر کر دیا اور ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔ ۵۔ تفسیر صافی جلد ۱۔

آیند اور خوبصورت ہے اور اس کا باطن بہت ہی گہرا اور وسیع ہے"۔ پھر فرماتے ہیں[1]: "قرآن مجید کا ایک باطن ہے (ایک باطنی معنی ہے) اور ہر باطن کے اندر سات باطن (معنی) ہیں اور اسی طرح آئمہ اہلبیتؑ کی احادیث میں بھی قرآن کے باطن کی طرف بہت زیادہ اشارے ہوئے ہیں۔[2]

ان احادیث کی اصل بنیاد اور ساکھ وہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ سورہ رعد آیہ ۱۷ میں بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اس آیہ کریمہ میں آسمانی فیض کو اس بارش سے تشبیہ دیتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور زمین و اہل زمین کی زندگیاں اس سے وابستہ ہیں۔ بارش آنے سے سیلاب جاری ہو جاتا ہے اور سیلاب کے مختلف راستے اپنے اندازے کے مطابق اس پانی کو اپنے اندر کھینچ لیتے ہیں اور ان کے اندر پانی بھر جاتا ہے اور وہ پانی جلدی ہو جاتا ہے۔ سیلاب کا پانی جھاگ اور کف سے پوشیدہ ہو جاتا ہے لیکن اس جھاگ کے نیچے بھی وہی پانی ہوتا ہے جو زندگی بخش ہے اور لوگوں کے لئے بہت ہی فائدہ مند ہوتا ہے۔[3]

جیسا کہ مندرجہ بالا مثال میں خداوند تعالیٰ اشارہ کرتا ہے، آسمانی معارف اور قرآنی علوم جو انسان کی معنویت کو جان بخشتے ہیں، کو حاصل کرنے میں لوگوں کے فہم و ادراک اور سوچ کی گنجائش بھی مختلف ہوتی ہے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس چند روزہ عارضی زندگی اور جہان گزراں میں مادّے اور مادّی زندگی کے علاوہ کسی اور چیز کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے اور اسی طرح مادی خواہشات کے بغیر کسی دوسری چیز میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ اور مادی نقصانات کے سوا کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے۔ ان لوگوں کو چاہئے کہ کم از کم اپنے درجات میں اختلاف کے لحاظ سے آسمانی معارف اور علوم کو قبول کریں اور اجمالی اعتقادات پر یقین کریں اور اسلام کے عملی دستور اور قانون پر عمل کریں اور آخر کار خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش اور عبادت، قیامت کے دن ثواب کی خواہش یا عذاب کے ڈر سے ہی کریں اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو صفائے

---

[1] سفینۃ البحار تفسیر صافی صفحہ ۱۵ اور تفسیر مرسلاً میں آنحضرتؐ سے حدیث نقل کی گئی ہے اور تفسیر کافی، تفسیر عیاشی، معانی الاخبار میں بھی ایسی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ [2] بحار الانوار جلد اول صفحہ ۱۱۷۔

[3] اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝

باطن اور صفائے فطرت کے ذریعے اپنی سعادت اور خوش بختی کو اس دنیا کی چند روزہ اور عارضی زندگی کی لذتوں میں نہیں جانتے اور اس جہان کے سود و زیان، نفع نقصان، تلخیوں اور شیرینیوں کو ایک دھوکے باز خیال (سراب) کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور ایسے ہی اس کاروانِ ہستی کے گزرے ہوئے لوگ جو گزشتہ زمانے میں سرخرو زندگی گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں اور آج ہمارے لئے افسانہ بن چکے ہیں، ان کی زندگیوں اور کارناموں سے عبرت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے پاک دلوں کے ذریعے فطری طور پر ابدی دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس ناپائیدار اور عارضی دنیا کے نقوش اور گوناگوں نظاروں کو خدا تعالیٰ کی نشانیوں کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن وہ اس کے لئے کسی قسم کی حقیقت، استقلال اور پائیداری کے قائل نہیں ہوتے۔

اس وقت یہ لوگ ان زمینی، دنیاوی اور آسمانی نشانیوں کے ذریعے خدائے پاک کی لامتناہی عظمت اور طاقت کو اپنے معنوی ادراک کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے ناپاک دل آفرینش، فطرت اور حقیقت کے رموز کے واقف اور شیفتہ ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ بجائے اس کے کہ ذاتی منفعت پرستی کے تنگ و تاریک غاروں میں مقید ہوں، ابدی دنیا کی لامتناہی فضا میں پرواز کرتے ہوئے اوپر ہی اوپر چلے جاتے ہیں۔

یہ لوگ جب آسمانی وحی کے ذریعے سنتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بتوں کی پرستش سے منع فرماتا ہے اس کے معنی ظاہری بتوں کے سامنے سجدہ نہ کرنے کے ہیں تو وہ اس ممنوعیت اور "نہی" کے ذریعے سمجھ جاتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور پرستش اور اطاعت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اطاعت کی حقیقت بھی بندگی اور سجدہ کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ لوگ اس سے اور زیادہ سمجھ جاتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے اور نہ ہی کسی سے امید اور توقع رکھنی چاہئے۔ اس سے بھی اوپر چلے جاتے ہیں اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نفسانی خواہشات کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے پھر اس سے بھی زیادہ سمجھ جاتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف نہیں توجہ کرنی چاہئے۔

اسی طرح جبکہ قرآن مجید کی زبانی سنتے ہیں کہ قرآن کریم نماز کا حکم دیتا ہے اور اس کے ظاہری

معنی صرف مخصوص عبادت کی انجام دہی کے ہیں تو باطنی طور پر وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جان و دل سے خدا کے سامنے خضوع و خشوع کے ساتھ سجدہ ریز ہو جانا چاہئے۔ پھر اس سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنے آپ کو، سچ جاننا چاہئے اور اپنے آپ کو بھول جانا چاہئے اور صرف خدا کی یاد میں ہی مصروف رہنا چاہئے۔

جیسا کہ واضح ہے مندرجہ بالا دو مثالوں میں جو باطنی معنی لکھے گئے ہیں وہ امر و نہی کے لفظی معنی نہیں ہیں لیکن جو لوگ وسیع طور پر تفکّر کرتے ہیں اور جہان بینی کو خود بینی پر ترجیح دیتے ہیں ان کے لئے ان معانی کا ادراک ناقابل اجتناب ہے۔

گزشتہ بیان سے قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی معنی واضح ہو گئے ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کا باطن اس کے ظاہر کو منسوخ نہیں کرتا بلکہ یہ ایک روح کی طرح ہے جو اپنے جسم کو زندگی اور جان دیتی ہے۔ اسلام ایک عمومی اور ابدی دین ہے جو انسانیت کی اصلاح اور بہتری کے لئے آیا ہے اور اس کے سامنے معاشرے اور انسانوں کی اصلاح بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے لہٰذا اسلام اپنے ظاہری قوانین سے جو معاشرے کی اصلاح کے لئے ہیں اور اپنے سادہ عقائد سے جو مذکورہ قوانین کے نگہبان اور محافظ ہیں، ہرگز ہاتھ نہیں اٹھاتا یا ان کو نظر انداز نہیں کرتا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک معاشرہ اس فریب اور دھوکے کے ساتھ کہ انسان کا دل پاک ہونا چاہئے اور عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہرج و مرج اور افراتفری کے ساتھ زندگی گزارے اور پھر بھی سعادت اور خوش بختی کو حاصل کرے؟ اور پھر یہ بھی کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ناپاک کردار اور گفتار، ایک پاک دل کو جنم دے سکے یا ایک پاک دل سے ناپاک کردار اور گفتار جنم لے؟ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی کتاب مقدّس میں فرماتا ہے: "پاک لوگ پاک لوگوں میں سے ہیں اور ناپاک لوگ ناپاک لوگوں میں سے ہیں" پھر فرماتا ہے: "اچھی زمین اپنی نباتات کو اچھی طرح پرورش کرتی ہے اور بری زمین سے برے فصل کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا" (سورہ اعراف آیت ۵۸) وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ۝

گزشتہ بیان کے ذریعے واضح ہوگیا ہے کہ قرآن مجید میں ظاہر اور باطن موجود ہے اور پھر باطن کے مختلف درجات بھی ہیں اور وہ احادیث نبوی جو قرآن کریم کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں، اگلے صفحات میں آئیں گی۔

قرآن مجید کی تاویل

اسلام کے اوائل میں اکثریت اہلسنّت میں یہ مشہور تھا کہ جس وقت ضرورت اور دلیل موجود ہو، قرآن مجید کے ظاہری معانی سے چشم پوشی کر کے معنوی اور باطنی معنی مراد لئے جاسکتے ہیں اور ان ظاہری معانی کے خلاف تفسیر کو "تاویل" کہا جاتا تھا، اور جس چیز کو قرآن مجید میں تاویل کہا گیا ہے وہی معنی تفسیر کو دیئے جاتے تھے۔ اہلسنت کی مذہبی کتابوں اور اسی طرح مختلف مذاہب کے مناظروں میں جو لکھے بھی جا چکے ہیں، یہ مسئلہ بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک مسئلے میں جو مذہبی علماء کے اجماع سے یا کسی اور وجہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر ایک آیت کے ظاہری معنی دوسری قرآنی آیات کے مخالف ہوں تو اس آیت کی تاویل کر کے خلاف ظاہر معانی کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی دو مخالف گروہ اپنے دو متقابل اقوال کے لئے قرآنی آیات سے دلائل سے حاصل کرتے ہیں اور دونوں گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کی آیات کی تاویل کرتا ہے۔

یہ طریقہ کم و بیش شیعہ مذہب میں بھی سرایت کر گیا ہے اور ان کی بعض علم کلام کی کتابوں میں بھی دیکھا جاتا ہے، لیکن جو چیز قرآنی آیات اور آئمہ اہلبیتؑ کی احادیث میں کافی غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے رس بھرے بیان اور واضح مطالب میں ہرگز معمّہ گوئی اور مبہم روش کو اختیار نہیں کیا ہے اور اپنے مطالب اور مضامین کو سوائے ظاہری معانی کے، اپنے ماننے والوں کے سامنے پیش نہیں کرتا اور جس کو قرآن مجید میں تاویل کہا گیا ہے، وہ لفظی معنی نہیں ہیں بلکہ وہ حقائق ہیں جو عام لوگوں کے فہم و ادراک سے بہت بالاتر ہیں جن میں سے اعتقادی معارف اور قرآن مجید کے عملی احکام سرچشمہ حاصل کرتے ہیں۔ ہاں! تمام قرآن مجید کی تاویل ہو سکتی ہے اور اس

کی تاویل بھی براہ راست غور و فکر اور فکر و تدبیر کے ذریعے قابلِ فہم نہیں ہے اور الفاظ کے ذریعے بھی اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور صرف خدا کے پیغمبرؐ، پاک لوگ اور اولیاء اللہ ہی جو انسانی آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں، اپنے مشاہدات کے ذریعے ان کو سمجھ سکتے ہیں، مگر قرآن مجید کی تاویل قیامت کے دن سب لوگوں پر ظاہر ہو جائے گی۔

وضاحت : ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جس چیز نے انسانوں کو بات کرنے، الفاظ بنانے اور ان الفاظ سے استفادہ کرنے پر مجبور کیا ہے وہ معاشرتی اور مادی ضروریات ہیں، انسان اپنی معاشرتی زندگی میں مجبور اور ناگزیر ہے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور اپنے ارادے کو اپنے ہم جنسوں کے سامنے پیش کرے، ان کو اپنے دل کی بات بتائے اور سمجھائے، اسی وجہ سے وہ اپنی آواز اور اپنے کانوں سے مدد لیتا ہے اور اس کے علاوہ کبھی کبھی اشاروں اور آنکھوں سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک گونگے اور ایک نابینا فرد میں یہ مفاہمت نہیں پائی جاتی، کیونکہ جو بات نابینا کرتا ہے، گونگا اور بہرہ شخص اس کو نہیں سن سکتا اور جس چیز کے بارے میں گونگا اشارہ کرتا ہے اسے نابینا شخص نہیں دیکھ سکتا۔ اسی وجہ سے الفاظ بنانے اور چیزوں کے نام رکھنے کے لئے مادی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے اور چیزوں کے بارے میں الفاظ بنائے گئے ہیں جو مادی ہیں یا احساس کے نزدیک ہیں، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شخص جس سے ہم بات کرنا چاہتے ہیں، اگر اس کے حواس خمسہ میں ایک حسّ کی کمی موجود ہے اور ہم اسی حس کے مطابق جو اس شخص میں موجود ہی نہیں ہے بات کریں تو ایک قسم کی مثال دے کر اپنے مطلب کو واضح کرتے ہیں یا اشارہ کرتے ہیں۔ اور اگر ایک پیدائشی نابینا شخص ہو اور ہم اس کے ساتھ روشنی یا رنگ کے بارے میں بات کریں یا ایک بچے کے ساتھ جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا ہے جنسی عمل کی لذّت کے متعلق بات کریں تو اپنے مطلب کو ایک دوسری چیز سے تشبیہہ دے کر یا مقابلہ کر کے یا مناسب مثال دے کر اسے سمجھاتے ہیں اور یوں اپنے مطلب کو ادا کرتے ہیں، لہٰذا اگر فرض کریں کہ اس جہان ہستی میں بعض حقائق اور رموز موجود ہیں جو مادّے اور مادّی آلائشوں سے پاک ہیں (اور حقیقت بھی یہی ہے) اور ہر زمانے میں انسانوں میں سے صرف

چند لوگ ان کے مشاہدے اور ادراک کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ حقائق و رموز لفظی بیانات اور عام تفکّر کے ذریعے قابل فہم نہیں ہوں گے اور مثال و تشبیہ کے بغیر ان کے بارے میں کچھ بتایا نہیں جا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: ہم نے اس کتاب کو پڑھے جانے والے الفاظ اور عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ شاید تم غور کرو اور سمجھ سکو، حالانکہ یہ امّ الکتاب (لوح محفوظ) میں ہمارے پاس موجود ہے جو بہت ہی بلند مقام ہے (یعنی عام فہم دماغ اس تک نہیں پہنچ سکتا اور اس کو نہیں سمجھ سکتا) اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○ (سورہ زخرف آیت ۳، ۴)

اور پھر فرماتا ہے: "بیشک یہی کتاب یعنی قرآن مجید ہے جو بہت ہی عزیز اور گرامی ہے اور اور حقیقت میں یہ عام نظروں سے پنہاں ہے کہ کوئی آدمی اس کو چھو نہیں سکتا مگر خدا کے پاک بندے"۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ○ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ○ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○

(سورہ واقعہ آیت ۷۷-۷۹)

اسی طرح پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے اہلبیتؑ کے بارے میں فرماتا ہے: "اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اے (پیغمبرؐ کے) اہلبیتؑ خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دور رکھے اور جیسا پاک و پاکیزہ رہنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ○ (سورۃ الاحزاب آیت ۳۳)

ان آیات کے ثبوت سے قرآن کریم کا منبع اور سرچشمہ اس جگہ ہے جہاں لوگوں کے فہم و ادراک کو ہرگز راہ نہیں ہے اور وہ لوگ اس تک پہنچنے سے عاری ہیں، صرف خدا کے پاک بندوں کے سوا کسی شخص کو اس تک رسائی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا دماغ وہاں تک پہنچ سکتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے اہلبیتؑ انہی پاک بندوں میں سے ہیں۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے: "یہ لوگ جو قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتے وہ اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں

جس کے علم کو وہ احاطہ نہیں کر سکتے اور ابھی تک اس کی تاویل ان پر ظاہر نہیں ہوئی ہے" (یعنی یہ تاویل ان پر قیامت کے دن ظاہر اور واضح ہوگی جب ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھا جا سکے گا) (سورہ یونس آیت ۳۹)

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ○

پھر ایک اور جگہ فرماتا ہے: "جس دن قرآن کی تاویل (پورا قرآن) ظاہر ہوگی تو جن لوگوں نے اس کو فراموش کر دیا تھا، اس دن نبوّت کی دعوت پر اعتراف کریں گے (سورہ اعراف آیہ ۵۳)

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ

حدیث کی بحث کا تتمّہ

اصل حدیث کا معتبر ہونا، جس کی قرآن مجید نے ضمانت اور تصدیق کر دی ہے، اس کے بارے میں شیعوں اور تمام دیگر مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن اسلام کے اوائل میں حکمرانوں کی طرف سے حدیث نبوی ؐ کی حفاظت میں جو کوتاہی ہوئی اور ایسے ہی صحابہ اور تابعین کی طرف سے حدیثِ رسول اکرم ؐ کو رواج دینے میں جو افراط (زیادتی) پیدا ہوئی اس کی وجہ سے حدیثِ نبوی سخت افسوس ناک حالت سے دوچار ہوگئی۔

ایک طرف تو خلفائے وقت حدیث لکھنے اور اس کی حفاظت سے منع کیا کرتے تھے اور ہر وہ ورق جس پر حدیث لکھی ہو، ملتا تھا تو اس کو ڈھونڈ اور کھوج کر جلا دیتے تھے اور کبھی کبھی حدیث بیان کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی جاتی تھی، اس وجہ سے بہت زیادہ احادیث میں تغیّر و تبدّل آگیا، یا بہت سی احادیث بھول گئیں یا ان کو بیان نہ کیا گیا۔

دوسری طرف پیغمبر اکرم ؐ کے صحابہ کرام جن کو پیغمبر اکرم ؐ کی احادیث سننے کا فخر حاصل رہا ہے وہ خلفائے وقت اور عام مسلمانوں کے لئے قابلِ احترام تھے، انہوں نے احادیث کی ترویج شروع کی

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کو قرآن مجید پر فوقیت اور حکمرانی مل گئی اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ حدیث کے حکم سے قرآن مجید کی آیت کو منسوخ کر دیا جاتا تھا۔[1]

اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ حدیث کو نقل کرنے والے اشخاص ایک حدیث کو سننے کے لئے کئی کئی میل کے سفر کی صعوبت اٹھایا کرتے تھے۔

بعض غیر مسلم اقراد جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور ظاہری طور پر اسلام بھی قبول کر لیا تھا اور ایسے ہی اسلام کے اندرونی دشمنوں نے حدیث میں تغیر و تبدل شروع کر دیا اور اس طرح حدیث کا اعتبار اور وثوق ختم کر دیا گیا۔[2]

اسی وجہ سے اسلامی دانشوروں کو فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے راہِ حل ڈھونڈنا شروع کیا، پھر انہوں نے بعض علوم پیدا کئے یعنی "علم رجال" اور "علم درایت" وغیرہ تاکہ درست اور غلط احادیث کو ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

لیکن شیعہ باوجودیکہ حدیث کی سند اور اصلاح اور پاک کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، حدیث کے متن کو قرآن کریم سے بھی مطابقت دیتے ہیں اور حدیث کے معتبر ہونے کے لئے اس عمل کو ضروری جانتے ہیں۔

مذہب شیعہ میں بہت زیادہ احادیث پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ سے پہنچی ہیں[3] جن کی قطعی سند موجود ہے۔ کیونکہ وہ حدیث جو قرآن مجید کے مخالف ہو ہرگز قابل قبول نہیں ہے اور صرف اسی حدیث کو ہی معتبر جاننا چاہئے جو قرآن کے عین مطابق ہو۔

اس بیان کے مطابق وہ احادیث جو قرآن مجید کے مخالف ہوں شیعہ ان پر عمل نہیں کرتے

---

[1] حدیث کے ذریعے قرانی آیت کو منسوخ کرنا "علم الاصول" کے مسائل میں سے ہے اور بعض علماء اس کے قائل ہیں۔ باغ فدک کے مسئلے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ اوّل بھی اس کے قائل تھے۔

[2] اس مطلب کی شہادت میں بہت زیادہ کتابوں کے نام لئے جا سکتے، کہ علماء نے احادیث کو جعل کیا ہے، اور اسی طرح کتب رجال میں "جھوٹے راوی" یا "احادیث جعل کرنے والوں" کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔

[3] بحار الانوار، جلد اوّل، صفحہ ۱۳۹۔

اور ایسے ہی وہ احادیث[1] جن کی قرآن مجید کے ساتھ مخالفت یا مطابقت معلوم نہیں، ان کے بارے میں آئمہ اہلبیتؑ کی طرف سے جو حکم ملتا ہے، قبول یا ردّ کئے بغیر ان کو ویسا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کے متعلق بحث نہیں کرتے، البتہ شیعہ مذہب میں بھی ایسے آدمی مل جاتے ہیں جو اہلسنت کی طرح، جو حدیث ان کو مل جاتی ہے اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

حدیث پر عمل کے بارے میں شیعوں کا طریقہ

وہ حدیث جو بلاواسطہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ کی زبانی سنی گئی ہو وہ قرآن کریم کا حکم رکھتی ہے، لیکن وہ حدیث جو بعض ذرائع سے ہم تک پہنچی ہو، شیعہ اس حدیث پر مندرجہ ذیل طریقے سے عمل کرتے ہیں:

اعتقادی معارف میں نصّ قرآن کی رُو سے علم اور یقین ضروری ہے لہٰذا جو احادیث متواتر (احادیث ثقہ) ہیں یا کوئی ایسی حدیث ہے جو قرائن و شواہد کے ذریعے ثقہ احادیث کے زمرے میں آتی ہے، اس پر عمل ضروری اور لازمی ہے، ان دو طریقوں کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے جس کو "خبرِ واحد" (یعنی وہ احادیث جو صرف ایک ہی ذریعے سے حاصل ہوئی ہے) کہتے ہیں۔ کسی حدیث کو قابل اعتبار اور قابل اعتماد نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن شرعی احکام میں جب کسی حکم کا نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے[2]، تو تعیّن شدہ طریقے اور دلائل پر نظر رکھتے ہوئے "حدیثِ متواتر اور حدیثِ قطعی" کے علاوہ "خبرِ واحد" (حدیثِ واحد) پر بھی عمل کیا جاتا ہے، بشرطیکہ اگر وہ کسی ذریعے اور طریقے سے قابلِ یقین اور قابل وثوق ہو۔

پس احادیث متواتر اور احادیثِ قطعی، شیعوں کی نظر میں مکمل طور پر لازم الاتباع یا واجب العمل (جن پر عمل کرنا فرض اور ضروری ہو) ہیں اور اسی طرح غیر قطعی اور غیر یقینی (خبرِ واحد) احادیث، بشرطیکہ کسی طریقے اور ذریعے سے قابل یقین ہو جائیں تو صرف شرعی احکام میں ہی حجت اور برہان ہوں گی (یعنی صرف شرعی احکام میں ہی ان کی پیروی اور اطاعت ضروری ہو گی نہ کہ تمام امور میں) اور یہ احادیث

---

[1] بحار الانوار جلد اوّل صفحہ ۵۵۔ [2] علم الاصول میں "خبرِ واحد" کے اعتبار کے بارے میں بحث۔

لازم الاتباع نہیں ہیں۔

اسلام میں عام تعلیم و تعلّم

علم حاصل کرنا دینِ اسلام کے فرائض میں سے ہے۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں[1]، علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور قطعی شواہد سے تصدیق شدہ احادیث کے مطابق اس علم کا مطلب اسلام کے تین اصولوں (توحید، نبوت، معاد یعنی روز قیامت) کو جاننا ہے، اور ایسے ہی ان کے قرینی علوم کو سمجھنا ہے، پھر اسلامی احکام اور قوانین کی تفصیلات کو سمجھنا ہے، یعنی ان تمام علوم کو حاصل کرنا فرض ہے، جس قدر بھی ہر انسان کر سکتا ہو اور زندگی میں اسے ضرورت ہوتی ہو۔

البتہ واضح ہے کہ اصولِ دین کے ساتھ علم حاصل کرنا، خواہ وہ اجمالی لحاظ سے ہی کیوں نہ ہو، ہر شخص کے لئے میسّر ہے اور ہر انسان کی طاقت میں بھی ہے، لیکن دینی قوانین اور احکام کے تفصیلی معنی کے لحاظ سے کتاب و سنّت (فقہ استدلالی) کے بارے میں ٹیکنیکل اور مستند علم حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف بعض لوگ ہی اسے حاصل کر سکتے ہیں اور اسلام میں طاقت فرسا (حرجی) حکم نہیں آیا ہے (یعنی کوئی ایسا حکم نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے انسان کو دکھ اور تکلیف ہو)

لہٰذا دلیل و برہان کے ذریعے دینی قوانین و احکام کے بارے میں علم حاصل کرنا "واجب کفایہ" ہے اور صرف بعض افراد سے متعلق ہے جو اس کی صلاحیّت اور طاقت رکھتے ہیں اور باقی تمام افراد کا فرض یہ ہے (جیسا کہ عام دستور اور قانون کے مطابق یعنی جاہل شخص ایک عالم اور فاضل شخص کی طرف رجوع کرے، عالم کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ) کہ مذکورہ اشخاص کی طرف رجوع کریں (جن کو مجتہد اور فقیہ یا عالم کہا جاتا ہے) اور اس رجوع کو تقلید کہا جاتا ہے، البتہ یہ رجوع اور تقلید اس رجوع اور تقلید کے علاوہ ہے جو اصول معارف میں موجود ہے اور قرآن مجید کی نصِ صریح "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" (الاسرا آیت ۳۶) کے مطابق ممنوع ہے[2]

---

[1] بحار الانوار جلد اول صفحہ ۵۵۔ [2] ان مسائل کو سمجھنے کیلئے علم الاصول سے اجتہاد اور تقلید کی بحث کی طرف رجوع کریں۔

یہ جاننا چاہئے کہ شیعہ ابتدائی تقلید میں مردہ مجتہد کی تقلید کو جائز نہیں جانتے یعنی جو شخص مسئلے کو اجتہاد کے ذریعے نہیں جانتا اور دینی فرض کے مطابق اسے ایک مجتہد کی تقلید کرنی چاہئے، پس وہ مجتہد جو زندہ نہیں ہے اس کے نظریئے کی تقلید نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر اس مجتہد کی زندگی میں اس کی تقلید کرتا رہا ہو، اس کی وفات کے بعد بھی وہ اس کا مرجع تقلید باقی رہے گا (یعنی مجتہد کی وفات کے بعد بھی اس کی تقلید کو جاری رکھ سکے گا) اور یہ مسئلہ شیعوں کی اسلامی فقہ کو زندہ اور تازہ رکھنے کے عناصر و عوامل میں سے ہے تاکہ کچھ لوگ ہمیشہ اجتہاد تک پہنچنے کی کوشش اور جد و جہد کرتے رہیں اور اس طرح فقہی مسائل میں اپنی تحقیق جاری رکھ سکیں، لیکن اہلسنّت پانچویں صدی ہجری میں اجماع امّت کی وجہ سے اپنی فقہ کے چار اماموں یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد حنبلؒ میں سے ایک کی تقلید کرتے ہوئے اجتہاد کو آزاد نہیں سمجھتے اور اسی طرح ان چار اماموں کی تقلید کے علاوہ کسی اور کی تقلید کو بھی جائز نہیں سمجھتے، اور اس کے نتیجے میں ان کی فقہ اسی سطح پر باقی رہ گئی ہے جیسا کہ بارہ سو سال پہلے تھی، لیکن اس آخری زمانے میں بعض افراد نے پرانی اجماع اور تقلید سے انکار کرتے ہوئے آزاد اجتہاد کو شروع کر دیا ہے۔

شیعہ اور نقلی علوم

اسلامی علوم جو علمائے اسلام کی تدوین و اختراع اور ایجاد کے مرہونِ منّت ہیں، دو حصوں میں منقسم ہیں یعنی "علوم عقلی" اور "علوم نقلی"۔ علوم نقلی وہ علوم ہیں جن کے مسائل کو لکھا جاتا ہے یا زبانی بیان کیا جاتا ہے مثلاً علم لغت، علم حدیث، علم تاریخ اور ایسے ہی دوسرے علوم اور علومِ عقلی ان کے علاوہ دوسرے تمام علوم ہیں مثلاً علم فلسفہ اور علم ریاضی وغیرہ جن کے بارے میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام میں علوم نقلی کی پیدائش کا اصلی سبب یا عنصر خود قرآن کریم ہی ہے اور دو تین علوم یا فنون مثلاً تاریخ، انساب اور عروض کے علاوہ باقی تمام علوم اسی آسمانی کتاب کے خانہ زاد ہیں۔

مسلمانوں نے دینی تحقیق و بحث کی رہنمائی میں ان علوم کو شروع کیا ہے جن میں اہم عربی ادبیات، علم نحو، صرف معانی، بیان، بدیع و لغت وغیرہ شامل ہیں اور ایسے ہی دینی ظواہر کے متعلقہ علوم مثلاً علم قرأت، علم تفسیر، علم حدیث، علم رجال، علم درایت، علم اصول اور علم فقہ ہیں۔

شیعوں نے بھی کوشش اور ہمت کے مطابق ان علوم کی تدوین اور تصنیف میں بہت ہی اہم اور خصوصی حصہ لیا، بلکہ ان میں سے بہت زیادہ علوم کے بانی بھی شیعہ ہی تھے، جیسا کہ علم نحو (عربی زبان کی گرامر) کو ابوالاسود دئلی نے جو پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے، حضرت علیؑ کی رہنمائی میں تدوین کیا تھا، اور اسی طرح علم فصاحت و بلاغت، علم معانی، بیان اور بدیع کے بہت بڑے مصنفین میں سے[1] ایک صاحب بن عباد شیعی تھے جو آلِ بویہ کے وزیر تھے۔ اسی طرح سب سے پہلے لغت کی کتاب[2] کتاب العین ہے جو مشہور و معروف دانشور اور ماہر علوم شیعہ خلیل بن احمد بصری نے لکھی تھی جو علم عروض کے بانی اور مصنف تھے اور علم نحو میں سیبویہ نحوی کے استاد بھی تھے۔

عاصم کی قرأتِ قرآن بھی ایک واسطے سے حضرت علیؑ تک پہنچتی ہے اور عبداللہ بن عباس جو علم تفسیر میں سب سے پہلے صحابی شمار ہوتے ہیں، حضرت علیؑ کے شاگردوں میں سے تھے اور علم حدیث اور علمِ فقہ میں اہلبیتؑ اور ان کے شیعوں کی کوششیں اور اسی طرح اہلسنت کے چار فقیہوں (فقہ کے چار اماموں) کا شیعوں کے پانچویں اور چھٹے امام کے ساتھ تعلق بھی مشہور ہے۔ اصول فقہ میں بھی وحید بہبہانی (وفات ۱۲۰۵ھ) کے زمانے میں عجیب ترقی ہوئی خصوصاً شیخ مرتضیٰ انصاری (وفات ۱۲۸۱ھ) کے ذریعے اصول فقہ (شیعہ) نے جو ترقی کی وہ اہلسنّت کے اصول فقہ سے قابل موازنہ نہیں ہے۔[3]

---

[1] وفیات ابن خلکان، صفحہ ۷۸۔ اعیان الشیعہ جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۱۔

[2] وفیات ابن خلکان صفحہ ۱۹۰۔ اعیان الشیعہ اور دوسری تمام کتب ترجمہ۔

[3] اتقان سیوطی۔

دوسرا طریقہ: عقلی بحث

- عقلی، فلسفی اور کلامی تفکّر۔
- اسلام کے فلسفی اور کلامی تفکّر میں شیعوں کی پیش قدمی۔
- فلسفہ اور دوسرے تمام عقلی علوم کے بارے میں شیعوں کی انتھک کوششیں۔
- شیعوں میں فلسفہ کیوں باقی رہ گیا ہے۔
- شیعوں میں سے چند ایک مشہور علمی شخصیتیں۔

عقلی، فلسفی اور کلامی تفکّر

اس سے پہلے[1] بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے علمی تفکّر (غور و فکر) کے لئے بہت زیادہ تاکید کی ہے، اور اس کو مذہبی تفکّر کا جزء قرار دیا ہے البتہ انعکاس کے طور پر عقلی تفکّر نے بھی پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور حقّانیت کی تصدیق کرنے کے بعد قرآنی ظواہر (شریعت کے احکام) جو آسمانی وحی ہیں اور پیغمبر اکرمؐ اور اہلبیتؑ کے بیانات کو بھی عقلی حجّت کی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور وہ عقلی دلائل جو انسان اپنی خداداد فطرت اور نظریات کے ذریعے ثابت کرتا ہے وہ دو قسم کے ہیں: "برہان اور جدل"۔

برہان:- وہ حجّت اور دلیل ہے جس کے مواد ابتدائی اور حقیقی ہوں۔ اگرچہ مشہور یا مسلّم بھی نہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں وہ مسائل ہیں جن کی ضروریات کو انسان اپنے خداداد شعور سے سمجھ لیتا ہے اور تصدیق کرتا ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں (تین کا عدد چار کے عدد سے چھوٹا ہے) اس قسم کا تفکّر، عقلی تفکّر کہلاتا ہے۔ اگر یہ تفکّر اس دنیا کے اندر مجموعی طور پر انجام پذیر ہو، مثلاً آفرینش کے مبداء میں تفکّر، لہٰذا دنیا اور اہل دنیا کا انجام فلسفی تفکّر کہلائے گا۔

---

[1] کتاب کے پہلے حصّے میں یہ بحث آچکی ہے۔

جدل :- وہ دلیل، بحث یا برہان ہے جس کا سارا یا کچھ مواد مشہور یا مسلّم اشیاء یا دلائل سے لیا گیا ہو، جبکہ مختلف ادیان یا مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان معمول ہے کہ اپنے مذہبی عقائد اور نظریات کو اس مذہب کے مسلّمہ اصول کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے دونوں طریقوں کو استعمال کیا ہے اور ان دونوں طریقوں کے بارے میں قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو (قرآن مجید) کائنات کے کلیّات اور ہر دو جہان کے مجموعی نظام اور ایسے ہی خاص نظاموں مثلاً آسمان، زمین، چاند، سورج، ستاروں، دن رات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کے متعلق آزاد تفکّر کی دعوت دیتا ہے اور آزاد عقل تحقیق کی بہترین الفاظ میں تعریف و توصیف کرتا ہے اور پھر عقلی، جدلی تفکّر جس کو عام طور پر "بحثِ کلامی" کہا جاتا ہے، کے لئے حکم صادر کرتا ہے بشرطیکہ یہ امر بہترین طریقے سے (یعنی بغیر کسی ضد بازی کے اچھے اخلاق کے ساتھ حق کا اظہار) انجام پائے، جیسا کہ فرماتا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (سورۃ النحل آیت ۱۲۵)

ترجمہ: (اے رسولؐ) تم (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور بحث و مباحثہ کرو بھی تو اس طریقے سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو۔

اسلام کے فلسفی اور کلامی تفکّر میں شیعوں کی پیش قدمی

یہ تو مکمل طور پر واضح ہے کہ شیعہ اقلیّت، سنی اکثریّت سے ابتدائے اسلام میں ہی جدا اور الگ ہوگئی تھی اور ہمیشہ اپنے مخالفین کے بارے میں خاص نظریات رکھتی تھی اور اپنے مخالف (اہلسنّت) کے ساتھ دلائل کے ساتھ بحث کرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ دلائل کے ساتھ بحث کرنا دو طرفہ ہے اور طرفین اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ شیعہ حملہ کرتے تھے اور دوسرے دفاع کرتے تھے اور جو شخص حملے میں پیشقدمی کرتا ہے وہ مجبور ہے کہ کافی ساز و سامان سے لیس ہو۔

پھر وہ ترقی جو تدریجاً کلامی بحثوں کو نصیب ہوئی اور دوسری صدی ہجری اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں معتزلی مذہب کے شروع ہو جانے سے یہ ترقی اوج پر پہنچ گئی اور شیعہ محققین اور علماء مکتب اہلبیتؑ کے شاگردوں میں تھے، بلکہ ان متکلّمین (بحث کرنیوالوں) کی صف اوّل میں شمار ہوا کرتے تھے۔

ان کے علاوہ[1] اہلسنّت کے متکلّمین (ماہرینِ علم کلام) کا سلسلہ بھی اشاعرہ اور معتزلہ سے ہوتا ہوا شیعوں کے پہلے امام، حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب کی کتابوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ صحابہ کی ان تمام کتابوں میں (جن کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تک پہنچتی ہے) حتیٰ کہ ایک کتاب بھی فلسفی تفکّر کے بارے میں نہیں لکھی گئی ہے، اور صرف حضرت امیر المومنین علیؑ ہی تھے جن کے دلچسپ اور دلکش بیانات "علم الٰہیات" کے عمیق ترین فلسفی تفکّر پر مشتمل ہیں۔

صحابہ اور علمائے تابعین جو اصلی صحابہ کے بعد آتے ہیں اور آخر کار عربی لوگ اس زمانے میں آزاد فلسفی تفکّر سے واقفیت اور آشنائی نہیں رکھتے تھے لہٰذا پہلی صدی کے دانش مندوں اور علماء کے اقوال و بیانات میں فلسفی تحقیق کا کوئی نہ کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ صرف شیعہ اماموںؑ کے پُر مغز بیانات اور خصوصاً امام اوّل اور امام ہشتمؑ کے بیکراں علمی خزانے فلسفی افکار پر مشتمل ہیں اور انہوں نے ہی اپنے شاگردوں اور ماننے والوں کی ایک اچھی تعداد و جماعت کو اس طرز فکر سے آشنا کیا تھا۔

عربی لوگ فلسفی طرز فکر سے ناواقف تھے، یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں بعض فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان سے عربی زبان میں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں یونانی، سریانی اور دوسری زبانوں سے بہت زیادہ کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہو گئیں، اس طرح فلسفی طرز تفکّر عام لوگوں کی دسترس میں آ گیا، مگر پھر بھی اکثر فقہاء اور متکلّمین (ماہرینِ علم کلام) فلسفہ اور دوسرے تمام عقلی علوم کی طرف، جو تازہ وارد مہمانوں کی حیثیت رکھتے تھے، زیادہ توجہ نہیں دیا کرتے تھے، اور یہ مخالفت شروع شروع میں اس لئے زیادہ مؤثر واقع نہ ہوئی تھی کیونکہ حکومت

۱؎ شرح ابن ابی الحدید، اوائل، جلد اوّل۔

وقت ان علوم کی حمایت کیا کرتی تھی، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد حالات بالکل تبدیل ہو گئے اور فلسفے کی کتابوں کے مطالعے کی سخت مخالفت اور ممانعت کے ساتھ ساتھ فلسفے کی تمام کتابوں کو سمندر میں پھینک دیا گیا اور رسائل اخوان الصفا جو مصنّفین کی ایک گمنام جماعت کے ذہن کی تراوش ہے ابھی تک اس زمانے کی یادگار باقی ہے، یہ رسائل اس بات کی گواہی اور شہادت دیتے ہیں کہ اس زمانے میں کیسے پریشان کن اور آشفتہ حالات تھے، اس زمانے کے بعد چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں فلسفہ، ابو نصر فارابی کے ذریعے دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اور پانچویں صدی ہجری کے شروع میں مشہور فلسفی دانشور بوعلی سینا کی کوششوں سے اس علم کی توسیع اور تکمیل ہوئی۔ چھٹی صدی ہجری میں بھی شیخ شہاب الدین سہروردی نے فلسفہ اشراق کو پاک کیا۔ اور اسی جرم کی وجہ سے ہی سلطان صلاح الدین ایوبی کے ایماء پر اس کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی اکثر لوگوں کے درمیان فلسفہ کی کہانی تقریباً ختم ہو گئی اور کوئی مشہور فلسفی پیدا نہ ہوا سوائے اس کے کہ ساتویں صدی ہجری میں اندلس میں جو اسلامی ممالک میں شمار ہوتا تھا، ابن رشد اندلسی پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفے کو پاک اور پاکیزہ کرنے کی کوشش کی۔[1]

فلسفہ اور دوسرے تمام نقلی علوم میں شیعوں کی انتھک کوشش

شیعہ مذہب اور شیعہ دانشور جیسا کہ شروع سے ہی فلسفی تفکّر کی پیدائش میں ایک اہم عنصر رہے ہیں، اس قسم کے تفکّر کی پیشرفت اور علوم نقلی کی ترویج میں بھی اہم رکن تھے اور ان علوم کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشش کیا کرتے تھے کیونکہ اگرچہ ابن رشد کی وفات سے اہلسنت کے اکثر لوگوں میں فلسفہ ختم ہو گیا تھا مگر شیعوں کے درمیان ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد بعض مشہور فلسفہ دان مثلاً خواجہ نصیر الدین طوسی، میر داماد اور صدر المتاھلین پیدا ہوئے جو یکے بعد دیگرے فلسفہ کی تعلیم اور تحریر کے لئے بہت زیادہ کوشش کرتے رہے ہیں۔

اس طرح تمام عقلی علوم میں بعض دانشور مثلاً خواجہ نصیر الدین طوسی اور بیر جندی وغیرہ پیدا ہوئے

---

[1] مندرجہ بالا مطالب اخبار الحکماء اور وفیات ابن خلکان اور دوسری ترجمہ کی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

یہ سب علوم اور خصوصاً فلسفۂ الٰہی شیعوں کی انتھک کوششوں کی وجہ سے بہت زیادہ ترقی کر گیا جیسا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی، شمس الدین ترکہ، میر داماد اور صدر المتالہین کی کتابوں کے مطالعے اور گزشتہ دانشمندوں کی کتب کے ساتھ مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔

شیعوں میں فلسفہ کیوں باقی رہ گیا؟

کیونکہ شیعوں میں فلسفی اور عقلی تفکّر کی پیدائش میں اہم ترین اور مؤثر ترین عنصر علمی ذخائر اور خزانے تھے۔ اور یہ تفکّر شیعوں کے ذریعے سے ہی دوسروں کے درمیان پیدا ہوا جو شیعوں کے اماموں اور پیشواؤں سے یادگار کے طور پر باقی رہ گیا تھا۔ اس طرز تفکّر کی بقاء میں اہم اور مؤثر عنصر شیعوں کے درمیان وہ علمی ذخائر ہیں جن کو شیعہ احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس مطلب کی وضاحت کے لئے کافی ہے کہ اہلبیتؑ کے علمی ذخائر کا فلسفے کی کتابوں کے ساتھ مقابلہ کریں جو کہ ہر زمانے میں لکھی گئی ہیں، کیونکہ اس طرح ہمیں صاف طور پر نظر آجائے گا کہ دن بدن فلسفہ مذکورہ علمی ذخائر کے بہت نزدیک آتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ گیارہویں صدی ہجری میں تقریباً ان دونوں (اہلبیتؑ کی علمی کتابوں اور فلسفہ کی کتابوں) نے مطابقت پیدا کر لی ہے اور ان کے درمیان سوائے تعبیر اور تشریح کے کوئی فاصلہ نہ رہا۔

شیعوں میں سے چند ایک مشہور علمی شخصیتیں

۱۔ ثقۃ الاسلام شیخ محمد بن یعقوب کلینی (وفات ۳۲۹ ہجری قمری) شیعوں میں سے پہلے شخص تھے جنہوں نے شیعہ روایات و احادیث کو اصول سے (ہر محدّث نے جو احادیث آئمہ اہلبیتؑ سے اخذ کی ہیں ان کو جمع کرتے تھے اور مذکورہ کتاب کو "اصل" کہا جاتا ہے) نکال کر اور ان کے بارے میں بڑے غور و خوض سے تحقیق کر کے ان کو ابوابِ فقہ کی ترتیب اور اعتماد سے مرتب کیا تھا۔ ان کی کتاب جو "کافی" کے نام سے مشہور ہے تین حصوں میں منقسم ہے یعنی اصول، فروع اور روضہ

(متفرقہ) اور اس کتاب میں سولہ ہزار ایک سو ننانوے (۱۶،۱۹۹) احادیث ہیں، اس طرح یہ کتاب حدیث کی کتابوں میں ایک معتبر اور مشہور کتاب ہے جو دنیائے شیعہ میں موجود ہے اور تین دوسری کتابیں "جو کافی" کے بعد آتی ہیں وہ یہ ہیں: "کتاب فقیہ" مؤلفہ شیخ محمد صدوق محمد بن بابویہ قمی (وفات ۳۸۱ ہجری قمری)، "کتاب تہذیب" اور "کتاب استبصار" تالیف شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ ق)

ب ــ ابوالقاسم جعفر بن حسن بن یحییٰ حلّی المشہور بہ "محقق" (وفات ۶۷۶ھ ق) آپ ماہر فقہ اور شیعہ فقیہوں میں سب سے بڑے عالم تھے، ان کے فقہی شاہکاروں میں سے ایک کتاب "نافع" اور دوسری کتاب "شرائع" ہے جو سات سو سال تک فقیہوں کے درمیان بہت زیادہ مشہور اور مقبول رہی ہیں اور ان کتابوں کو بڑی قدردانی اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

محقق حلّی کے بعد شہید اوّل شمس الدین محمد بن مکّی کو شمار کرنا چاہئے، جن کو ۷۸۶ ھ ق میں دمشق میں شیعہ ہونے کے الزام میں شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے فقہی شاہکاروں میں سے ایک کتاب "لمعہ دمشقیہ" ہے جو ان کی گرفتاری کے بعد سات دن کے اندر جیل میں لکھی گئی تھی اور اسی طرح شیخ جعفر کاشف الغطاء نجفی (وفات ۱۲۲۷ھ ق) کو بھی انہی دانشوروں میں شمار کرنا چاہئے۔ ان کے فقہی شاہکاروں میں ایک کتاب "کشف الغطاء" ہے۔

ج ــ شیخ مرتضیٰ انصاری شوشتری جنہوں نے ۱۲۸۱ ھ ق میں وفات پائی، انہوں نے علم اصول فقہ کو کانٹ چھانٹ کر صاف کیا اور عملی اصول کے طریقے کو جو اس فن اور علم کا سب سے اہم حصہ ہے تحریر فرمایا۔ اب ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ ان کا مکتب تمام شیعہ فقہا کیلئے معتبر اور جاری ہے۔

د ــ خواجہ نصیرالدین طوسی (وفات ۶۷۶ھ ق) آپ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے علمِ کلام کو فنّی اور ٹیکنیکل شکل میں مدوّن کیا اور ان کے علمی شاہکاروں میں سے ایک کتاب "تجویدالکلام" ہے جس کو سات سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ کتاب اب تک اہلِ فن کے درمیان معتبر ہے اور اسی لئے عام و خاص نے اس کتاب پر بہت زیادہ شرحیں لکھیں اور حاشئے بھی لکھے ہیں، خواجہ نصیرالدین طوسی علم کلام میں بہت مہارت رکھنے کے علاوہ فلسفہ اور ریاضیات میں بھی اپنے زمانے کی

ماہر شخصیّت رہے ہیں اور اس دعوے کا بہترین ثبوت ان کی گرانقدر تالیفات ہیں جو انہوں نے تمام عقلی علوم میں لکھی تھیں، ان عقلی علوم میں سے وہ رصدخانہ بھی ہے جو آپ نے مراغہ شہر میں ہلاکو خان کی حکومت میں بنوایا تھا۔

ھ ــــ صدرالدین محمد شیرازی (ولادت ۹۷۹ھ ق وفات ۱۰۵۰ھ ق) آپ سب سے پہلے فلسفی ہیں جنہوں نے فلسفے کے مسائل کو (اگرچہ فلسفہ صدیوں تک اسلام میں مختلف مراحل طے کرتا رہا تھا) انتشار اور پراگندگی سے باہر نکالا اور ریاضی کی طرح اس کو ایک منظّم اور مرتّب شکل دی۔

اس طرح سب سے پہلے تو فلسفے کو یہ امکان اور وقار ملا کہ وہ سینکڑوں فلسفی مسائل جو پہلے کبھی فلسفہ میں داخل اور قابل بحث نہیں سمجھے گئے تھے۔ اب ان کو پیش اور حل کیا گیا۔ پھر عرفانی مسائل کو (کہ اس زمانے تک ایسے مسائل کو ورائے عقل کی قسم یا ناقابلِ ادراک اور ایسی معلومات میں شمار کیا جاتا تھا جو حس و ادراک اور فہم و شعور سے بالاتر ہیں) بڑا آسان اور قابل بحث بنایا، اور ان کے بارے میں بحث اور نظریات قائم کئے۔ تیسرا یہ کہ ظواہرِ دین (احکام شرع) میں بہت سے علمی ذخیرے اور خزانے اور ائمہ اہلبیتؑ کے گہرے فلسفی بیانات جو صدیوں تک لاینحل معمّہ کے طور پر موجود تھے اور ان میں سے اکثر "متشابہات" میں شمار ہوتے تھے، حل اور واضح ہوگئے اور اسی طرح دینی ظواہر، عرفان اور فلسفہ میں بھی ایک قسم کی مکمل مفاہمت پیدا ہوگئی اور ان تینوں علوم نے ایک مشترکہ راستہ اختیار کرلیا۔ صدرالمتاھلین سے پہلے بھی بعض دانشمند اور فلسفی پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی مولف کتاب "حکمۃ الاشراق" چھٹی صدی ہجری کے فلسفی اور شمس الدین محمد ترکہ جو آٹھویں صدی ہجری کے فلسفی تھے وغیرہ، جنہوں نے اس میدان میں مؤثر قدم اٹھائے لیکن مکمل کامیابی صدرالدین شیرازی صدرالمتاھلین کو ہی ملی۔

صدرالمتاھلین اس روش اور طریقے کے ذریعے کامیاب ہوگئے کہ "جوہری حرکت" کے نظریئے کو ثابت کریں اور اس کے بعد "رابع اور نظریۂ اضافیت" کو (ذہن کے باہر نہ ذہن اور فکر کے اندر) دریافت کریں۔ انہوں نے تقریباً پچاس کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کئے اور ان شاہکاروں میں سے ایک کتاب "اسفار" چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا طریقہ: کشف

- انسان اور عرفانی ادراک۔
- اسلام میں عرفان کا ظہور۔
- عرفانِ نفس اور اس کے منصوبوں کی طرف کتاب وسنت کی رہنمائی۔

انسان اور عرفانی ادراک

اگرچہ دنیا کے تمام انسان اپنی معاشی حالت کو سدھارنے اور روزمرّہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معنویات کی طرف توجہ نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود ان افراد کی سرشت میں ایک فطرت یا احساس موجود ہے جس کو حقیقت بینی کا "احساس یا غریزہ" کہا جاتا ہے جو کبھی کبھی بعض انسانوں میں پیدا اور جاری ہوتا ہے اور یہی احساس ان کو بعض معنوی مطالب کے سمجھنے کیلئے ابھارتا ہے۔

ہر انسان (سوفسطائیوں اور شکاکوں کے علاوہ جو حقیقت اور واقعیّت کو ایک خیال و گمان یا وہم وخرافات جانتے ہیں) ایک ثابت اور مستقل حقیقت پر ایمان رکھتا ہے اور جب کبھی اپنے صاف ذہن اور پاکیزہ فطرت کے ساتھ اس کائنات کی مستقل اور ثابت حقیقت کو میں غور کرتا ہے تو اس وقت اس دنیا کے تمام اجزاء کی ناپائداری کو سمجھ لیتا ہے۔ دنیا اور دنیا کے مظاہر کو ایک آئینے کی طرح دیکھتا ہے جو خوبصورتی کی مستقل حقیقتوں کو نظروں کے سامنے لے آتے ہیں کہ ان حقائق کو سمجھنے کی لذت دیکھنے والوں کی نظروں میں ہر دوسری لذّت کو ذلیل وخوار اور پست کر دیتی ہے لہٰذا فطری طور پر یہ لذتیں انسان کو ان دوسری تمام لذتوں کی طرف لے جانے سے روکتی ہیں جو اس دنیا میں موجود ہیں اور مادّی زندگی کی ناپائیدار لذّتوں پر مبنی ہیں۔

یہ وہی عرفانی جذبہ ہے جو خداشناس انسان کو عالم بالا (خدا) کی طرف متوجہ کرتا ہے اور خدائے

پاک کی حجّت کو انسان کے دل میں جاگزین کرتا ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز کو بھلا دیتا ہے اور اس طرح انسان کی تمام مادّی، دنیاوی آرزوؤں اور خواہشوں پر خطِ بطلان کھینچ دیتا ہے۔ پھر انسان کو خدائے غائب کی کی پرستش اور عبادت کے لئے ابھارتا ہے، جہاں ہر چیز واضح اور آشکار ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ بھی باطنی کشش کا نتیجہ ہے جس کے ذریعے خدائی اور آسمانی مذاہب اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں، "عارف" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مہر و محبّت اور عشق کے ساتھ خدا کی عبادت اور پرستش کرے نہ کہ ثواب کی امید اور عذاب کے ڈر سے۔[1] یہاں یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ عرفان کو ہرگز دوسرے مذاہب کے مقابلے میں ایک مستقل مذہب نہیں جاننا چاہئے بلکہ عرفان عبادات کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے (یعنی محبت اور عشق کے ساتھ عبادت، نہ کہ امید اور خوف سے) اور مذاہب کے حقائق کو سمجھنے کے لئے ایک راستہ ہے جو ظواہر دینی اور عقلی تفکّر کے مقابلے میں ایک طریقہ ہے۔

خدا پرستی (توحید) کے تمام مذاہب حتیٰ کہ ثنویت (دو خداؤں پر ایمان) میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سلوک (عرفان) کے ذریعے خدا تک پہنچتے ہیں یا عبادت کرتے ہیں اور ایسے ہی ثنویّت، یہودیّت، عیسائیّت، مجوسیّت اور اسلام میں بھی عارف لوگ موجود ہیں اور غیر عارف بھی۔

اسلام میں عرفان کا ظہور

پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب میں (جن کی تعداد کتب رجال میں تقریباً بارہ ہزار (۱۲،۰۰۰) لکھی ہوئی ہے اور ان کی شناخت ہو چکی ہے) سے صرف حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں جن کے فصیح و بلیغ بیانات عرفانی حقائق اور معنوی زندگی کے مراحل اور بیکران علمی ذخائر پر مشتمل ہیں۔ وہ تحریریں جو تمام صحابہ کرام سے

---

[1] امام ششمؑ فرماتے ہیں: "عبادت تین قسم کی ہے۔ ایک جماعت ڈر اور خوف سے خدا کی عبادت کرتی ہے اور وہ غلاموں کی عبادت ہے۔ دوسرا گروہ نیک صلے اور ثواب کی خاطر خدا کی پرستش کرتا ہے اور ایسی پرستش مزدوروں کی پرستش ہے۔ لیکن بعض لوگ مہر و محبت اور عشق کے ساتھ خدا کی عبادت کرتے ہیں اور یہی عبادت آزاد لوگوں کی عبادت کہلاتی ہے۔ اور یہی سب سے اچھی عبادت ہے۔" (بحارالانوار جلد ۱۵ صفحہ ۲۰۸)

ہم تک پہنچی ہیں ان میں اس قسم کے مسائل موجود نہیں ہیں۔ آپ کے اصحاب اور شاگردوں میں سے بعض سلمان فارسی، اویس قرنی، کمیل بن زیاد، رشید ہجری اور میثم تمّار ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جن کو عام اسلامی عارف لوگ حضرت علیؑ کے بعد اپنے سلسلوں کے بانی اور روحانی مرشد کہتے ہیں۔ اس گروہ اور طبقے کے بعد بعض دوسرے افراد مثلاً طاؤس یمانی، مالک بن دینار، ابراہیم ادھم اور شفیق بلخی ایسے افراد ہیں جو دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے تھے اور تصوّف وعرفان کو آشکار نہ کرتے ہوئے بھی عام زاہدوں اور لوگوں کے لئے اولیاء اللہ اور پاک بندوں کے طور پر مشہور تھے۔ لیکن بہرحال یہ لوگ اپنے سے پہلے طبقے کے ساتھ اپنے تعلقات کو مخفی نہیں رکھتے تھے۔

اس طبقے کے بعد دوسری صدی ہجری کے آخر اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ایک دوسرا گروہ پیدا ہوا جن میں بایزید بسطامی، معروف کرخی، جنید بغدادی اور ایسے ہی دوسرے اولیاء اللہ شامل ہیں جنہوں نے عرفانی سیر وسلوک کی وادی میں قدم رکھا اور تصوّف وعرفان کو آشکار کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ کشف و شہود اور کرامت کا اظہار بھی کیا کرتے تھے، لہٰذا یہ لوگ اپنے ناشائستہ اور ناپسندیدہ اظہارات و بیانات کی وجہ سے اپنے وقت کے فقیہوں اور متکلمین (ماہرین علم کلام) کو اپنے خلاف ابھرنے کا موقع دیا کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے لئے بہت زیادہ مشکلات پیدا ہوگئیں، اس طرح ان میں سے بہت زیادہ افراد کو قید و بند اور شکنجوں کی سزائیں دی گئیں، حتیٰ کہ بعض کو سولی پر بھی چڑھا دیا گیا۔

اس کے باوجود یہ لوگ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور اس طرح دن بدن طریقت میں توسیع اور ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہ تصوّف وعرفان اور طریقت بہت زیادہ وسعت اور طاقت اختیار کر گئی۔ اس کے بعد کبھی اوج اور کبھی تنزّل پر پہنچتی رہی اور آج تک اپنے طریقوں اور زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہے[1]

اگرچہ مشائخ عرفان، جن کے نام تذکروں میں محفوظ ہیں، ظاہری طور پر مذہب اہلسنّت رکھتے ہیں، اور وہ طریقت جو آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں (کہ ایک قسم کے آداب و رسوم پر مشتمل ہے اور کتاب

---

[1] ترجمہ شدہ کتابوں مثلاً تذکرۃ الاولیاء (عطار) اور تصوف کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

وسنّت میں ایسی تعلیم ہرگز موجود نہیں ہے) انہی کی یادگار ہے، پھر بھی ان کے بعض آداب و رسوم شیعوں میں بھی سرایت کر چکے ہیں یا شیعوں سے ملتے جلتے ہیں۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے، ایک گروہ کا عقیدہ یہ تھا کہ اسلام میں سیر وسلوک کا منصوبہ یا پروگرام صاف طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ معرفتِ نفس (خودی) کا طریقہ ہی ایسا طریقہ ہے جس کو مسلمانوں نے شروع کیا تھا اور یہی خدا کا پسندیدہ اور مقبول طریقہ ہے مثلاً رہبانیّت کا طریقہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی دعوت حق اور تبلیغِ دین میں موجود نہ تھا لیکن عیسائیوں نے خود بخود اس کو گھڑ کر مقبول بنا دیا ہے [1]

اس طرح مشائخِ طریقت میں سے ہر ایک نے جس طرح بھی آداب و رسوم کے مطابق ٹھیک سمجھا اسے اپنے سیر وسلوک کے پروگراموں اور منصوبوں میں جاری کر دیا اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اس طریقے کی پیروی کریں لہٰذا یہ طریقہ یا پروگرام آہستہ آہستہ ایک مستقل اور وسیع شکل اختیار کر گیا۔

مثلاً مریدی اختیار کرنے کی رسومات، ذکر اور وظیفے کی تلقین، خرقہ پہنانا، موسیقی کا استعمال، خوراک و غذا کا پروگرام، ذکر اور وظیفے کے وقت وجد میں آنا اور کبھی کبھی بعض فرقوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شریعت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور پھر شریعت و طریقت میں جدائی پڑ گئی لہٰذا اس طریقے کے جانبدار اور طرفدار و پیروکار عملی طور پر باطنی فرقے کے ساتھ ملحق ہو گئے، لیکن شیعوں کے عقیدتی قوانین کے پیش نظر جو چیز حقیقی اسلام اور اس کے اصلی اصولوں اور اسناد سے ثابت ہوتی ہے (یعنی کتاب وسنّت سے) وہ اس عقیدے اور طریقے کے بالکل خلاف ہے اور اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دینی اسناد و بیانات (آیات و احادیث) اس حقیقت کی طرف رہنمائی نہیں کرتے یا اس کے بعض پروگراموں اور منصوبوں کو واضح کرنے میں سستی کرتے ہیں یا کسی شخص کے متعلق (خواہ کوئی بھی ہو)

---

[1] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (سورہ حدید آیہ ۲۷) ترجمہ: اور وہ رہبانیت جس کو عیسائیوں نے خود گھڑ لیا ہے، ہم نے اسے اس طرح ان پر نازل نہیں کیا ہے بلکہ ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ وہ خدا کی رضا کو قبول کریں، لیکن انہوں نے جس طرح کہ چاہئے تھا خدائے تعالیٰ کی رضا کو مدنظر نہیں رکھا۔

فرائض اور حلال و حرام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

عرفانِ نفس اور اس کے منصوبوں کی طرف کتاب و سنّت کی رہنمائی

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں چند جگہ فرماتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ قرآن مجید میں تفکّر اور غور کریں اور اس کے ساتھ ہی اس کے احکام پر عمل کریں اور صرف معمولی اور سطحی طور پر سمجھنے پر ہی قناعت نہ کریں اور اپنی بہت زیادہ آیات میں دنیائے فطرت کا اور اس کے علاوہ جو کچھ اس میں موجود ہے کسی استثناء کے بغیر اپنی آیات اور نشانیوں کا تعارف کراتا ہے۔

آیت یا نشانی کے معنی میں تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت یا نشانی اس وجہ سے آیت اور نشانی ہے کہ دوسری چیز کو واضح کرے نہ کہ اپنے آپ کو مثلاً سرخ بتی جو خطرے کی علامت ہے اور ایک جگہ پر نصب کی جاتی ہے، اس کو دیکھنے سے انسان خطرے کا احساس کرتا ہے اور خطرے کے سوا اس کے ذہن میں اور کوئی چیز نہیں آتی، لہٰذا اس کو دیکھنے سے انسان صرف سرخ بتّی کی طرف توجہ نہیں کرتا (بلکہ خطرے کی طرف توجہ کرتا ہے) اور اگر بتی کی شکل اور شیشے کی خاصیّت یا رنگ کا خیال کرے تو اس کے ذہن میں بتی کی صورت یا شیشے اور رنگ کے سوا کچھ نہیں آئے گا، نہ کہ خطرے کا تصوّر۔

لہٰذا اگر دنیا اور دنیا کے مظاہر سب کے سب اور ہر لحاظ سے خداوند کریم کی نشانیوں کے طور پر سمجھے جائیں تو یہ سب چیزیں الگ وجود کی مالک نہیں ہوں گی اور جس طرح بھی ان میں غور کیا جائے خداوند پاک کی نشانیوں اور علامتوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، اور جو شخص قرآنی تعلیمات اور ہدایات کے ذریعے اس تصوّر سے دنیا اور اہلِ دنیا کی طرف توجہ کرے کہ وہ خدائے پاک کے سوا کسی اور چیز کو نہیں دیکھے گا اور اسی طرح دنیا کی خوبصورتی اور رعنائی جو دوسرے لوگوں کو جہان کے نقشے پر نظر آتی ہے، کے مقابلے میں وہ ایک لامتناہی خوبصورتی کو دیکھے گا جو اس دنیا کے تنگ دریچے سے اپنی تجلّی کو ظاہر کرتی ہے اور اس وقت انسان اپنی زندگی کے خرمن کو برباد کر کے اپنے دل کو

خدا کی محبّت اور عشق میں محو کر دیتا ہے۔

جیسا کہ واضح ہے، یہ ادراک، کانوں، آنکھوں یا دوسرے حواس یا عقل و خیال کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان چیزوں یا اعضاء کا کام خود بھی خدا کی نشانیوں اور علامتوں یا آیات میں ہے لہٰذا یہ تمام حواس اس ادراک و ہدایت کو حاصل کرنے میں عاجز اور قاصر ہیں۔[1]

اور وہ سالک جو خدا کی یاد میں ماسواء اللہ کو فراموش کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جب وہ سنتا ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنے کلام پاک میں ایک جگہ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

ترجمہ: اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اپنے نفس (خودی) کو پہچانو، کیونکہ جب تم نے حقیقی راستے کو پہچان لیا تو دوسرے لوگ جو گمراہ ہو چکے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ (سورہ مائدہ ۱۰۵)

تو اس وقت سمجھ لے گا کہ صرف وہی شاہراہ جس پر چل کر حقیقی اور کامل ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے، انسانی نفس (خودی) کا ہی راستہ ہے اور انسان کے حقیقی راہنما تے جو اس کا خدا ہے، اس انسان کو ذمہ دار اور خود مختار بنا دیا ہے۔ تاکہ اپنے آپ کو پہچانے اور تمام دوسرے راستوں اور طریقوں کو نظر انداز کر کے صرف نفس (خودی) کا طریقہ اپنائے اور اپنے نفس (ذات) کے ذریعے خدا کو دیکھے اور پہچانے، پھر اپنے حقیقی اور واقعی مطلوب کو پالے گا۔

اس طرح پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:-

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

"جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا"۔

اور پھر فرماتے ہیں:-

اَعْرَفُكُمْ بِنَفْسِهِ اَعْرَفُكُمْ بِرَبِّهِ

---

[1] حضرت علیؑ فرماتے ہیں، خدا وہ نہیں جو کسی کی عقل و معرفت کے دائرے میں آسکے بلکہ خدا وہ ہے جو دلیل و برہان کو اپنی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۸۶)

تم میں سے وہی شخص خدا کو بہتر طور پر پہچانتا ہے، جو اپنے آپ کو بہتر پہچانتا ہے۔"
لیکن سیر و سلوک کا منصوبہ اور پروگرام! اس سے متعلق قرآن کریم کی بہت زیادہ آیات موجود ہیں جو خدا کو یاد کرنے کا حکم دیتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (سورۃ البقرہ آیت ۱۵۲)

مجھے یاد کرو تاکہ میں بھی تمہیں یاد کروں۔

اور اس کے علاوہ دوسری آیات، اعمال صالح (نیک اعمال) کے متعلق قرآن و سنّت میں تفصیلات آئی ہیں اور آخر میں فرماتا ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب آیت ۲۱)

اپنے پیغمبرؐ کی پیروی کرو۔

پس کیسے ممکن اور متصوّر ہو سکتا ہے کہ اسلام، خدا کے راستے کو تو تشخیص دے اور پھر لوگوں کو اس راستے پر چلنے کی تاکید اور وصیّت نہ کرے؟

یا اس راستے کو دوسروں کے سامنے تو پیش کرے لیکن اس کے منصوبوں اور پروگراموں کو بیان کرنے میں غفلت یا سستی کرے؟

حالانکہ خداوند تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے :

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورۃ النحل آیت ۸۹)

ہم نے قرآن کو تم پر نازل کیا ہے اور یہ کلام ہر اس چیز کے بارے میں واضح بیان کرتا ہے، جو لوگوں کے دین و دنیا سے متعلق ہو۔

تیسرا حصّہ :

اسلامی عقائد کے بارے میں

بارہ امامی شیعوں کا نظریّہ

خداشناسی (خدا کی پہچان)

- زندگی اور حقیقت کے پیش نظر دنیا پر ایک نظر۔ خدا کی ضرورت۔
- باب کا خاتمہ (خدا کی وحدانیت) انسان اور جہان کے رابطے سے ایک اور نظر۔
- ذات و صفات۔
- خدائی صفات کے معنی۔
- صفات کے معنی میں مزید وضاحت۔
- فعل کی صفات۔
- قضاو قدر
- انسان اور اختیار۔

زندگی اور حقیقت کے پیش نظر دنیا پر ایک نظر۔ خدا کی ضرورت

انسانی ادراک (عقل) اور شعور جو انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے، بالکل شروع سے ہی انسان پر دونوں جہانوں کے خدا کی ہستی کو واضح کر دیتا ہے، کیونکہ ان لوگوں کے عقائد کے بالکل خلاف جو زندگی میں ہر چیز پر شک و تردید کا اظہار کرتے ہیں اور جہاں ہستی کو صرف ایک وہم و گمان اور خیال کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی عقل و شعور رکھتا ہے اور وہ اپنی دنیا اور اپنے آپ کو بخوبی سمجھتا ہے، یعنی اسے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا کہ وہ موجود ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں بھی موجود ہیں اور جب تک یہ انسان، انسان ہے، اس میں عقل و شعور اور علم موجود رہتا ہے لہٰذا اس کے لئے کسی قسم کے شک و تردید کی گنجائش نہیں ہوتی اور علم و شعور اور عقل میں بھی ہرگز تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔

یہ حقیقت اور ہستی جس کو انسان ایک سوفسطائی یا شک کرنے والے کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، پہلے ہی سے ثابت شدہ ہے اور اس میں ہرگز بطلان پیدا نہیں ہوتا یعنی سوفسطائی اور شک کرنے والے شخص کے اقوال جو دراصل واقعیت اور حقیقت کی نفی ہیں، ہرگز درست نہیں ہیں۔ پس جہان ہستی (کائنات) میں ایک ثابت اور پائیدار حقیقت موجود ہے۔

لیکن یہ تمام حقیقی مظاہر جن کو ہم اس دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں کچھ عرصے کے بعد ان کی حقیقت ختم ہو جاتی ہے اور یہ سب نابود ہو جاتے ہیں۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے تمام اجزاء خود بخود عینِ حقیقت نہیں ہیں (کہ جو نابود اور فنا ہونے نہ پائیں) بلکہ یہ سب ایک پائیدار اور مستقل حقیقت سے وابستہ ہیں اور اسی پائیدار حقیقت کے ذریعے ہی یہ حقیقت دار ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے ان کو زندگی ملتی ہے، لہٰذا جب تک اس حقیقت کے ساتھ رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں اس حقیقت کی موجودگی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں لیکن جونہی اس سے ان کا تعلق ختم ہو جاتا ہے،

تو فوراً نابود ہو جاتے ہیں۔[1] ہم اس پائیدار اور مستقل (لازوال) حقیقت کو " واجب الوجود " یعنی خدا کہتے ہیں۔

انسان اور جہان کے رابطے سے ایک اور نظر

وہ طریقہ جو گزشتہ باب میں خدا کی ہستی کو ثابت کرنے کے لئے بتایا گیا ہے، وہ طریقہ بہت ہی سادہ اور واضح ہے کہ انسان اپنی خداداد قابلیت اور سرشت کے ساتھ اسے اپنا سکتا ہے اور اس طریقے میں کوئی پیچ و خم بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن بہت زیادہ لوگ مادیات کی طرف متوجہ ہونے اور محسوس لذائذ میں محو و مستغرق ہونے کے سبب اپنی خداداد سادہ اور پاک فطرت کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہیں، کیونکہ ایسی حالت میں معنویات کی طرف توجہ دینا بہت ہی مشکل اور سخت کام ہے۔

بنا برین اسلام جو کہ اپنے آپ کو ایک عمومی دین کہتا ہے اور تمام انسانوں کو اپنے دینی مقاصد کے سامنے مساوی جانتا ہے، ایسے لوگوں کے لئے، خدا کی ہستی کو ثابت کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اور جس طرح لوگوں کی توجہ سادہ فطرت (دین) سے ہٹ گئی ہے اسی طرح ان سے بات کرتا ہے اور اپنی ذات کو پہچنواتا ہے۔

قرآن کریم مختلف طریقوں سے عام لوگوں کو خداشناسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ان کے افکار کو دنیا کی آفرینش اور اس نظام کی طرف متوجہ کراتا ہے جو اس دنیا میں حکومت کر رہا ہے (جاری و ساری ہے) اور پھر انفس و آفاق کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے، کیونکہ انسان اپنی چند روزہ زندگی میں جو راستہ یا طریقہ بھی اختیار کرے یا جس حالت میں زندگی گزارے، وہ دنیائے فطرت اور

---

[1] خدائے بزرگ و برتر اپنی کتاب میں اس دلیل و برہان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ ابراہیم آیت ۱۰) ترجمہ (ان کے پیغمبر نے کہا) کیا خدا میں بھی شک کیا جا سکتا ہے؟ وہ خدا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (جس نے عدم کو چیر کر اس میں آسمانوں اور زمین کو ظاہر کیا ہے؟)

اس میں موجودہ نظام کی حکومت سے ہرگز باہر نہیں نکل جا سکتا اور اس کا شعور و ادراک، زمین و آسمان کے عجیب و غریب مناظر کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔

یہ وسیع جہان ہستی (نظام کائنات)[1] جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) اس کا ہر ایک جزو اور ذرّہ کلی طور پر ہمیشہ تغیّر و تبدل کا شکار ہے اور ہر لحظہ اس کی شکل و صورت دگرگوں ہو کر ایک نیا روپ دھار لیتی ہے جو پہلے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

اور پھر قوانین کے زیر اثر جس میں استثناء موجود نہیں ہے، حقیقت اور اثبات کا لباس پہن لیتی ہے اور اسی طرح بہت بلند اور دور کہکشانوں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذرے تک جن سے اس جہان کی تشکیل و تکمیل ہوئی ہے، ہر چیز ایک خاص اور واضح نظام میں حرکت کرتی ہے اور اپنے قوانین کے ذریعے جس میں کسی قسم کی استثناء موجود نہیں ہے، بڑے حیرت انگیز طریقے سے یہ ساری چیزیں اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں، لہٰذا یہ سب اشیاء اپنے دائرہ عمل کو بہت ہی پست اور نچلی سطح سے مکمل ترین حالت کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچ جاتی ہیں۔

اور خصوصی نظاموں، عمومی نظاموں اور آخرکار عام دنیاوی نظام سے بالاتر جن کے بے شمار اجزاء

---

[1] خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ (سورۃ الجاثیہ آیت ۳-۶)

ترجمہ: بیشک آسمان اور زمین میں ایمان لانے والوں کے لئے (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں، اور تمہاری پیدائش میں (بھی) اور جن جانوروں کو وہ (زمین پر) پھیلاتا رہتا ہے (ان میں بھی) یقین کرنے والوں کے واسطے بہت سی نشانیاں ہیں، اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور خدا نے آسمان سے جو (ذریعہ) رزق (پانی) نازل فرمایا پھر اس سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد زندہ کیا (اس میں) اور ہواؤں کے پھیر بدل میں عقلمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ خدا کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک (ٹھیک) تمہارے سامنے پڑھتے ہیں۔ تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

ایک دوسرے کو آپس میں مربوط کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نظاموں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اپنی دائمی حرکت میں ہرگز کسی استثناء کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی ان نظاموں میں کسی قسم کی ہرج و مرج پیدا ہوتی ہے۔

مثلاً اگر فطرت کا نظام انسان کو زمین میں جگہ دیتا ہے تو اس زمین کے وجودی ڈھانچے کو اس طرح ترکیب (مختلف اجزاء کا مجموعہ) دیتا ہے کہ اس کی زندگی اور ماحول کے ساتھ سازگار ہو اور پھر اس زندگی اور ماحول کو اس طرح بناتا ہے کہ ایک مہربان دایہ کی طرح مہر و محبت کے ساتھ اس کی پرورش کرتے ہوئے کائنات کی ہر چیز مثلاً سورج، چاند، ستارے، پانی، مٹی، دن، رات، سال کے موسموں، بادل، ہوا، بارش، زمین کے نیچے اور زمین کے اوپر موجود ذخائر اور خزانے اور آخر کار اپنی قدرت اور طاقت کے تمام وسائل اور سرمائے کو اس کے آرام و آسائش کی خاطر کام پر لگائے رکھتا ہے۔ ہم ایسے رابطے اور تعلق کو دنیا کے ہر مظہر اور اس کے اردگرد اور ہمسایہ چیزوں کے درمیان مشاہدہ کرتے ہیں، یعنی دنیا کے تمام مظاہر، جن میں انسان زندگی گزارتا ہے، آپس میں مربوط ہیں۔

کائنات کے ہر مظہر کے داخلی نظام میں بھی اس قسم کا تعلق اور رابطہ موجود اور ظاہر ہے۔ اگر فطرت نے انسان کے لئے روٹی مہیا کی ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ اور کھانے کے لئے منہ اور چبانے کے لئے دانت بھی دیئے ہیں اور ان تمام چیزوں کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک قسم کے منظم ذرائع کے ساتھ آپس میں مرتبط کر رکھا ہے۔ یعنی ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے۔ (بقاء اور کمال)

دنیا کے ماہرین اور دانشور اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رکھتے کہ وہ بے شمار تجربے جو انہوں نے اپنی چند ہزار سالہ علمی کاوشوں کے ذریعے حاصل کئے ہیں وہ فطرت اور کائنات کے اسرار میں سے ایک بہت ہی معمولی جلوہ ہیں، جس کے پیچھے ایک بہت ہی طویل اور بے انتہا سلسلہ موجود ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ ہر تازہ انکشاف انسان کے سامنے بے شمار مجہولات (جن چیزوں کا علم نہ ہو) لے آتا ہے (جس میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے)

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وسیع جہانِ ہستی (کائنات) جس کے تمام اجزاء الگ الگ ہوتے ہوئے بھی آپس میں ایک مضبوط اتحاد اور وحدت و اتصال اور حیرت انگیز اتفاق رکھتے ہیں اور یہ سب ایک

لامتناہی طاقت اور علم کو بیان کرتے ہیں، ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے ؟ اور یہ سب کچھ اپنے آپ، عبث اور فضول پیدا ہوگیا ہے۔

آیا یہ جزئی اور کلّی نظامات اور آخرکار دنیا کا عمومی نظام، جس نے دنیا کے لاانتہا اجزاء کو آپس میں مربوط اور متصل کرکے ایک بڑا متحدہ کائناتی نظام (ONE UNIT UNIVERSAL SYSTEM) بنا دیا ہے، اپنے منظّم قوانین کے ساتھ جس میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے، ہر چیز میں جاری و ساری ہے کیا یہ سب کچھ بغیر کسی نقشے کے اتفاقیہ طور پر بن گیا ہے ؟ یا ان میں سے ہر ایک مظہر اور کائنات کے چھوٹے بڑے ماحول نے اپنی پیدائش سے پہلے ہی اپنے لئے ایک خاص نظام اور طریقہ انتخاب کرلیا ہے؟ اور اپنی پیدائش کے بعد اس نظام کو خاص موقع و محل کے مطابق نافذ اور جاری کرتا ہے۔

البتہ وہ انسان جو ہر حادثے، واقعے اور مظہر کو ایک علّت اور سبب یا حادثے سے منسوب کرتا ہے اور کبھی کبھی ایک مجہول سبب اور علّت کو پیدا کرنے کے لئے مدّتوں بحث، کوشش اور جستجو میں گزار دیتا ہے اور کبھی کبھی علمی کامیابیوں کے پیچھے چکر لگاتا رہتا ہے، وہ انسان جو ان چند اینٹوں کو دیکھ کر جو بڑی ترتیب کے ساتھ ایک دوسری کے اوپر نیچے رکھی گئی ہوں، اس کو ایک طاقت اور علم کے ساتھ منسوب کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے اتفاق اور حادثے کی نفی کرتے ہوئے اس کو ایک نقشے اور مقصد کا نتیجہ سمجھتا ہے، وہ ہرگز اس بات پر تیار نہیں ہوگا کہ اس کائنات اور جان ہستی کی پیدائش کو بے سبب اور بے علّت سمجھے یا دنیا کے نظام کو ایک اتفاقیہ حادثہ خیال کرے۔

پس یہ جہان اور کائنات ایک خاص نظام کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں اور وہی نظام اس میں حکومت کرتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا بہت ہی عظیم ہے، جس نے اپنے بیکراں اور ختم نہ ہونے والے علم اور طاقت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک خاص، نہج اور طریقے یا ہدف کی طرف چلا رہا ہے اور وہ وقتی اور چھوٹے چھوٹے حوادث اور بعض دوسرے اتفاقات جو اس جہان میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب حالات و واقعات اسی نکتے تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں ہر طرف سے اسی (خدا) کی تسخیر اور احاطے میں واقع ہیں۔ ہر چیز اپنی زندگی میں اسی (پروردگار) کی محتاج ہے اور وہ کسی چیز

کا محتاج یا نیازمند نہیں ہے اور اس کا کوئی منبع یا سرچشمہ نہیں ہے (نہ کسی کو اس نے پیدا کیا اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا ہے (لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ)

باب کا خاتمہ (خدا کی وحدانیّت)

فرض کریں کائنات کی حقیقتوں میں سے ہر ایک حقیقت محدود ہے یعنی فرض اور تقدیر (سبب اور شرط) کے ساتھ ہر چیز زندہ ہے اور فرض و تقدیر (سبب و شرط) کے نہ ہونے کی بناء پر منفی ہے یعنی زندہ نہیں ہے۔ دراصل ہر چیز کا وجود ایک حد کے اندر ہے اور اس حد کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف خدا کی ذات ہی ہے جس کے لئے کوئی حد فرض نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس کی حقیقت مطلق ہے اور ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے لہٰذا کسی سبب اور شرط کے ساتھ اس کو مرتبط نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی ذات کسی علّت اور شرط کی محتاج ہے۔

واضح ہے کہ لامتناہی اور محدود چیز کے لئے کوئی عدد فرض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہر دوسری چیز جو پہلی چیز کے لئے فرض کے طور پر لائی جائے گی وہ پہلی چیز کے علاوہ ہوگی۔ پس نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں چیزیں محدود اور لامتناہی ہوں گی اور ایک دوسری کی حدود اور حقیقت کے برابر ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر اگر ایک حجم کو لامحدود و لامتناہی فرض کریں تو اس کے برابر کسی دوسرے حجم کو فرض نہیں کر سکتے اور اگر فرض کریں گے تو دوسرا حجم پہلے حجم کے برابر اور مانند ہو جائیگا۔ پس خدائے تعالیٰ یکتا، یگانہ اور بے مثال ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔[1]

---

[1] جنگ جمل میں ایک عربی شخص حضرت علیؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا: "یا امیرالمومنین، آپ فرماتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟"
لوگوں نے ہر طرف سے اس پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور کہنے لگے: "کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ امیرالمومنینؑ کو کس قدر پریشانی اور تشویش ہے اور تم یہ سوال پوچھ رہے ہو؟"
امیرالمومنین حضرت علیؑ نے فرمایا: "اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ جو کچھ یہ عربی شخص جاننا چاہتا ہے یہ وہی مطلب ہے کہ ہم جو اس جماعت پر واضح کرنا چاہتے ہیں۔" پھر اس عربی شخص سے فرمایا: "یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے،
(بقیہ اگلے صفحے پر)

ذات اور صفات

اگر ایک انسان کا عقلی لحاظ سے تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کی ذات ہے اور یہ ذات وہی ذاتی انسانیت یا شخصیّت ہے اور اس کے ساتھ وہ صفات بھی رکھتا ہے جس سے اس کی ذات (شخصیّت) کو پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً وہ فلان کا بیٹا ہے اور اس کا باپ فلاں شخص ہے۔ وہ دانا ہے، طاقتور ہے، اس کا قد اونچا ہے، وہ خوبصورت ہے یا ان صفات کے برعکس ہے۔

اگرچہ ان صفات میں سے بعض صفات مثلاً صفتِ اوّل اور دوم ہرگز ذات سے جدا نہیں ہیں اور بعض دوسری صفات مثلاً دانائی اور طاقت میں تبدیلی کا امکان موجود ہے، لیکن بہرحال سب کی سب صفات اس کی ذات کے علاوہ ہیں اور ہر صفت میں فرق ہے۔

ذات اور صفت یا تمام صفات میں فرق بہترین ثبوت اور دلیل ہے کہ وہ ذات جس کی صفت موجود

چار طرح سے ہے، جن میں سے دو طریقے ٹھیک نہیں ہیں اور دو طریقے ٹھیک ہیں، لیکن جو دو طریقے ٹھیک نہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خدا ایک ہے اور اس کے لئے عدد اور نمبر کو سامنے رکھے تو یہ معنی ٹھیک نہیں ہیں، کیونکہ جس کی مثال نہیں ہے وہ عدد میں محدود نہیں ہوسکتا۔ آیا تجھے معلوم نہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں (باپ، بیٹا، روح۔ عیسائیوں کی تثلیث کی طرف اشارہ ہے) وہ کافر ہوگئے تھے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص انسانوں میں سے ایک ہے، یعنی انسانوں کی جنس میں سے ایک ہے (یا اس قسم اور جنس کا ایک جزء ہے) یہ معنی بھی خدا کے لئے ٹھیک نہیں ہیں، کیونکہ یہ تشبیہ ہے اور خداوند تشبیہ سے مبرّا اور پاک ہے۔ لیکن دوسرے دو مطلب اور معنی کہ جو خدا کی یکتائی کے بارے میں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی کہے کہ خدا ایک ہے جس کی اشیاء میں کوئی مثال یا تشبیہ نہیں ملتی۔ خدا ایسے ہی ہے اور دوسرا یہ کہے کہ خدا ایک ہے (احد ہے اور اس میں کوئی کثرت نہیں اور نہ ہی اس کی قسمیں ہیں) یعنی نہ تو عقل کے اندر سما سکتا ہے اور نہ ہی وہم و گمان میں آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے باہر کوئی حد موجود ہے"۔
(بحار الانوار صفحہ ۶۵)

پھر حضرت علیؑ نے فرمایا: "خدا کو پہچاننے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو واحد یگانہ، یکتا اور بے مثال جاننا چاہئے"۔
(بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۸۶) یعنی خدائے تعالیٰ کے وجود کا اثبات جو لامتناہی اور لامحدود ہے اس کی وحدانیت کو ثابت کرنے میں ہی کافی ہے، کیونکہ لامحدود چیز کے لئے دوسری کوئی مثال تصور نہیں کی جاسکتی۔

ہو، اور وہ صفت جو ذات کا تعارف کراتی ہو، دونوں محدود اور متناہی ہیں، کیونکہ اگر ذات لامحدود اور لامتناہی ہو تو صفات بھی ویسی ہی ہوں گی اور تمام صفات ایک دوسری کے برابر ہوں گی اور آخرکار سب کی سب ایک ہو جائیں گی، جیسا کہ فرض کیا تھا کہ انسان کی ذات، طاقت تھی اور اسی طرح طاقت، عقلمندی (دانائی) بلندی اور خوبصورتی تمام کی تمام ایک دوسری کی مانند تھیں۔ لہٰذا مجموعی طور پر ان سب کا صرف ایک ہی مطلب تھا (یعنی انسان)

گزشتہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ عزّ وجل کے لئے صفت کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جس کا ہم نے پہلے تجزیہ کیا ہے کیونکہ خدا کے لئے کوئی صفت ثابت نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ صفت حدود کے بغیر نہیں ہوتی اور خدا کی پاک ذات ہر حدود سے بالاتر ہے (حتیٰ کہ یہی پاکی دراصل خدا کی صفت کو ثابت کرتی ہے)

خدائی صفات کے معنی

جہانِ آفرینش (فطرت اور کائنات) میں بہت زیادہ کمالات موجود ہیں جو صفات کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ مثبت صفات ہیں جو ہر جگہ ظاہر ہوتی ہیں اور اپنے وجود کو کامل اور مکمل کرتے ہوئے اس کو زیادہ سے زیادہ وجودی اہمیّت کے قابل بناتی ہیں جیسا کہ ایک زندہ چیز مثلاً انسان کا مقابلہ ایک بے جان اور بے روح چیز مثلاً پتھر کے ساتھ کریں تو واضح ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان تمام کمالات و صفات کو خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور اسی نے ہی یہ صفات دوسری چیزوں کو دی ہیں اور اگر خود خدا میں یہ صفات و کمالات موجود نہ ہوتے تو وہ دوسروں کو ہرگز نہ دیتا یا نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی ان کی تکمیل کرتا۔ لہٰذا عقلِ سلیم کے مطابق یوں کہنا چاہئے کہ خدائے تعالیٰ علم و قدرت رکھتا ہے اور ہر حقیقی کمال اسی کے پاس ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے علم اور طاقت کے آثار، اور ان آثار کے نتیجے میں کائنات کے نظام کی زندگی بھی ظاہر ہے۔

لیکن اس مطلب کے پیشِ نظر کہ ذاتِ خداوندی لامحدود اور لامتناہی ہے، یہ کمالات جو اس کے لئے صفات کی شکل وصورت میں ثابت ہوتے ہیں، حقیقت میں عین ذات اور اس طرح ایک دوسرے کے بالکل برابر اور مانند ہیں۔[۱] اور وہ فرق جو ذات وصفات یا خود صفات کے درمیان نظر آتا ہے صرف مفہوم کے طور پر ہے، لیکن حقیقت میں ایک ناقابلِ تقسیم یکتائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

اسلام اس غلطی کے سدِّ باب کے لئے (یعنی صفات کے ذریعے وحدانیت یا اصل کمال کی نفی) اپنے پیروکاروں کے عقیدے اور ایمان کو نفی واثبات کے درمیان ہی رکھتا ہے اور اس سے متجاوز نہیں ہوتے دیتا۔ اور[۲] حکم دیتا ہے کہ اس قسم کے عقائد رکھیں یعنی خدا علم رکھتا ہے لیکن اس کا یہ علم دوسروں کے علم کی طرح نہیں ہے۔ وہ طاقت رکھتا ہے لیکن اس کی یہ طاقت انسانوں کی طاقت کی طرح نہیں ہے۔ وہ سنتا ہے لیکن کانوں کے ذریعہ نہیں (اس کے کان نہیں ہیں)، وہ دیکھتا ہے لیکن آنکھوں سے نہیں۔ (اس کی آنکھیں نہیں ہیں) اور اسی طرح دوسری صفات۔

---

[۱] امام ششمؑ فرماتے ہیں: "خدا کی ذات اور ہستی ثابت ہے (ناقابل تغیر یا ناقابل تقسیم ہے) اور اس کا علم بھی وہ خود ہی ہے حالانکہ معلوم (وہ چیز جس کا علم ہو) نہیں تھا اور اس کی شنوائی بھی وہ خود ہی ہے حالانکہ سنی جانے والی چیز (صدا اور آواز) موجود نہ تھی اور اس کی بینائی بھی وہ خود ہی ہے۔ حالانکہ دیکھی جانے والی چیز موجود نہ تھی (خدا کے علم، اس کی بینائی اور شنوائی کی کوئی مثال نہیں ہے کیونکہ یہ صفات اس وقت بھی موجود تھیں جبکہ کوئی دوسری چیز موجود نہ تھی۔"
(بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۲۵) اور اہلبیتؑ کی احادیث اس بارے میں بہت زیادہ ہیں۔ نہج البلاغہ، توحید، عیون اور بحار الانوار جلد ۲ کی طرف رجوع کریں۔

[۲] پانچویں، چھٹے اور آٹھویں امامؑ فرماتے ہیں: "خدائے تعالیٰ ایک نور ہے جو ظلمت کے ساتھ مخلوط نہیں ہے اور خدا ایک علم ہے جس میں جہالت موجود نہیں ہے اور وہ ایک زندگی ہے جس کو کبھی موت نہیں ہے۔" (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۲۹)
آٹھویں امامؑ فرماتے ہیں: "عوام خدائی صفات کے بارے میں تین عقائد رکھتے ہیں۔ ایک جماعت صفات کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ ثابت کرتی ہے اور دوسری جماعت چیزوں کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے، لیکن ایک جماعت صفات کی نفی کرتی ہے۔ حقیقی طریقہ تیسری جماعت کا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ صفات کا اثبات دوسری چیزوں کے ساتھ تشبیہ کے بغیر کیا جائے۔ (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۹۴)

صفات کے معنی میں مزید وضاحت

صفات دو قسم کی ہیں: "مکمل صفات اور ناقص صفات" مکمل صفات جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، اثباتی معنی رکھتی ہیں جو اپنے وجود کی زیادہ اہمیّت کا باعث بنتی ہیں اور اپنے موصوف کے وجودی اعتبار کو زیادہ کرتی ہیں، جیسا کہ ایک زندہ، جاندار، طاقتور اور عقلمند چیز یا وجود کو ایک مُردہ، بے علم، بے طاقت چیز یا وجود کے ساتھ مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور ناقص صفات اس کے برعکس ہیں۔

جب ہم ناقص صفات کے معانی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ معنی کے لحاظ سے یہ صفات منفی ہیں اور ان میں کمال موجود نہیں ہے اور ایسے ہی وجودی اہمیّت کے نہ ہونے کی خبر دیتی ہیں مثلاً جہالت، عجز، بے عقلی، بدصورتی، بیماری اور بدی وغیرہ۔

لہٰذا گزشتہ موضوع کے مطابق صفات کی نفی، مکمل صفات کے نہ ہونے کے معنی دیتی ہے مثلاً نادانی کی نفی دانائی کے معنوں میں ہے اور ناتوانی کی نفی توانائی کے معنی دیتی ہے۔

قرآن کریم ہر مکمل صفت کو براہ راست خدائے تعالیٰ کے بارے میں ثابت کرتا ہے اور ہر ناقص صفت کی نفی کرتے ہوئے اس کی نفی کو خداوند تعالیٰ کے بارے میں ثابت کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ (سورۃ الروم آیت ۵۴) هُوَ الْحَيُّ، لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرۃ آیت ۲۵۵) وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ (سورۃ التوبہ آیت ۲)

ایک مطلب کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک مطلق حقیقت ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے اور اسی طرح ہر[1] کامل صفت بھی جو اس کے بارے میں ثابت ہوتی ہے

---

[1] امام ششم ؑ فرماتے ہیں: "خدائے تعالیٰ زمان و مکان اور حرکت و سکون اور نقل و انتقال کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا بلکہ وہ زمان و مکان کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے۔ (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۹۶)

وہ بھی محدود معنوں میں نہیں ہوگی۔ وہ (خدا) مادّی، جسمانی قیود یا مکان و زمان کی حدود میں محدود نہیں ہے اور ہر صفت سے منزّہ اور پاک ہے کیونکہ ہر وہ صفت جو حادث ہو خدا اس صفت سے پاک ہے اور ہر وہ صفت جو حقیقت میں خدا سے منسوب کی جاتی ہے وہ محدودیت کے معنی سے بالکل دور ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (سورہ شوریٰ آیہ ۱۱)

صفاتِ فعل

صفات (جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے) مختلف اقسام میں تقسیم ہوتی ہیں یعنی "صفاتِ ذات" اور "صفاتِ فعل"۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ کبھی ایک صفت خود موصوف کے ساتھ قائم ہوتی ہے، مثلاً زندگی، علم اور طاقت جو ایک زندہ، دانا اور توانا انسان کے ساتھ قائم ہیں اور ہم صرف انسان کو ہی ان کے ساتھ متصف فرض کرسکتے ہیں، اگرچہ اس کے بغیر کسی اور چیز کو فرض بھی نہ کریں۔ اور کبھی کبھی صرف موصوف کے ساتھ ہی قائم نہیں ہے، کیونکہ اگر موصوف کو ان صفات کے ساتھ متصف کریں تو اس وقت ہمیں پہلے بعض دوسری چیزوں کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے مثلاً لکھنا، بولنا (تقریر کرنا) اور چاہنا وغیرہ، کیونکہ انسان اس وقت تک ادیب نہیں بن سکتا جب تک دوات، قلم اور کاغذ کو فرض نہ کرلیا جائے اور اسی وقت تقریر کرسکتا ہے جب اس کے لئے سننے والے کو فرض کرلیا جائے اور اس وقت کسی چیز کو چاہتا ہے جب چاہنے والی چیز موجود ہو اور صرف ان صفات کو ثابت کرنے کے لئے انسان کا فرض ہی کافی نہیں ہے۔

یہاں واضح ہوجاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی حقیقی صفات (جیساکہ پہلے گزر چکا ہے) عینِ ذات ہیں اور صرف پہلی قسم کی ہیں، لیکن دوسری قسم کی صفات جن کو ثابت کرنے میں بعض دوسری چیزوں کا سہارا لینا ضروری ہے، خدا کے سوا ہر چیز مخلوق ہے اور خدا کے بعد پیدا ہوئی ہیں لہٰذا ہر چیز اپنی پیدائش کے ساتھ جو صفات اپنے ساتھ لاتی ہے، ان کو "صفتِ ذات" اور خدائے تعالیٰ کی مانند "عینِ

ذات" نہیں کہا جا سکتا۔

وہ صفات جو خدائے تعالیٰ کے لئے کائنات کی پیدائش کے بعد ثابت اور منسوب ہوتی ہیں مثلاً آفریدگار، کردگار، پروردگار، زندہ کرنے والا، مارنے والا اور روزی دینے والا وغیرہ، وہ عینِ ذات نہیں ہیں بلکہ ذات کے علاوہ ہیں اور ان کو "صفتِ فعل" کہا جاتا ہے۔

صفتِ فعل کا مطلب یہ ہے کہ فعل کے ثابت اور عملی ہونے کے بعد، صفت کے معنی فعل سے حاصل کئے جاتے ہیں نہ کہ ذات سے، مثلاً آفریدگار، جو کائنات اور مخلوقات کی پیدائش ثابت ہو جانے کے بعد خدا کے آفریدگار (پیدا کرنے والا) ہونے کے معنی اس سے ماخوذ ہوتے ہیں اور یہ معنی صرف مخلوقات کے ساتھ قائم ہیں، نہ کہ خداوند پاک کی مقدّس ذات کے ساتھ، کیونکہ اگر ایسا ہو تو ذات میں بھی صفت کے ساتھ ساتھ تبدیلی واقع ہو جائے گی۔

شیعہ، دو صفات یعنی "ارادہ" اور "کلام" اور ان سے حاصل ہونے والے معانی کو صفتِ فعل جانتے ہیں[1] کیونکہ ارادہ چاہنے کے معنی میں ہے اور کلام کا مطلب ہے "الفاظ کا انکشاف" اور علمائے اہلسنّت ان صفات کو علم کے معنی میں لیتے ہیں اور انہی کو "صفتِ ذات" کہتے ہیں۔

قضا و قدر

کائنات میں علّت اور سبب کا قانون بغیر کسی استثناء کے حکم فرما اور جاری ہے۔ اس

---

[1] امام ششم ؑ فرماتے ہیں: "خداوند تعالیٰ ہمیشہ اپنی ذات میں "عالم" تھا حالانکہ "معلوم" موجود نہیں تھا اور "قادر" تھا، حالانکہ مقدور (طاقت) موجود نہیں تھا" راوی کہتا ہے "میں نے عرض کیا کیا متکلّم بھی تھا؟" آپ نے فرمایا: "کلام حادث ہے، خدا موجود تھا، لیکن کلام موجود نہ تھا، اس کے بعد خدا نے کلام کو پیدا کیا (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۴۷)

اور امام ہشتم ؑ فرماتے ہیں: "لوگوں کا ارادہ "ضمیر" ہے اور اس کے بعد "فعل" پیدا ہوتا ہے، اور خدا ہی اس کا پیدا کرنے والا ہے اور بس۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ ہماری طرح تردید، وہم اور تفکّر نہیں رکھتا" (یعنی ان صفات سے پاک ہے) (بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۴۴)

قانون کے مطابق اس جہان کا ہر مظہر یا مخلوق اپنی پیدائش میں ایک سبب یا علّت پر منحصر ہے (اسباب اور ان کا عملی ہونا) کہ فرض کریں اگر یہ بھی اسباب پورے ہو جائیں (جس کو علّتِ تامہ کہتے ہیں) تو مظہر کی پیدائش (معلول و مفروض) ضروری یا جبری ہو جاتی ہے اور اگر فرض کریں کہ یہ سب یا ان میں سے بعض اسباب موجود نہ ہوں تو مذکورہ مظہر کی پیدائش محال ہو جاتی ہے۔

اس نظریہ میں تحقیق اور جستجو کے ساتھ ہمارے لئے مندرجہ ذیل دو مطلب واضح ہو جاتے ہیں:۔

۱۔ اگر ہم ایک مظہر (معلول) کو مجموعی علّتِ تامّہ اور اسی طرح علّتِ تامہ کے اجزاء کے ساتھ پرکھیں تو علّتِ تامّہ کے ساتھ اس کی نسبت (رشتہ) "نسبتِ ضرورت" (جبر) پر ہوگی، اور علّتِ تامّہ کے تمام اجزاء (جن کو علّتِ ناقصہ کہا جاتا ہے) کے ساتھ اس کی نسبت، "نسبتِ امکان" کی ہوگی کیونکہ ہر علّت کا ایک جزو، معلول کی نسبت صرف امکانِ وجود رکھتا ہے نہ کہ ضرورتِ وجود (جبری پیدائش)

بنا برایں یہ کائنات جس کے اجزاء کا ہر مظہر اپنی پیدائش میں اپنی "علّتِ تامّہ" کے ساتھ لازمی تعلق رکھتا ہے۔ اس کی پیدائش میں ایک ضرورت کارفرما ہے اور اس کا جسم ایک قسم کے قطعی اور ضروری حوادث پر منحصر ہے لہٰذا اس کے اجزاء میں "صفتِ امکان" (وہ مظاہر جو اپنی علّت کے علاوہ کسی اور علّت کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھتے ہیں) محفوظ رہتی ہے۔

قرآن کریم اپنی تعلیمات میں ضرورت (جبر) کے اس حکم کو قضائے الٰہی کہتا ہے، کیونکہ یہی جبر اور ضرورت کائنات کے پیدا کرنے اور بنانے والے کی ذات سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے، اسی وجہ سے حکم اور "یقینی قضا" ہے جس میں کسی قسم کی خلاف ورزی یا تبدیلی ممکن نہیں ہے اور یہ بالکل عادلانہ ہے اور اس میں کسی قسم کا امتیاز یا استثناء موجود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (سورۃ الاعراف آیت ۵۴)

اور پھر فرماتا ہے: وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (سورۃ البقرہ آیت ۱۱۷)

اور پھر فرماتا ہے: وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (سورۃ رعد آیت ۴۱)

۲۔ علّت کا ہر جزء اپنے معلول (نتیجے) کے مناسب اور مطابق ہوتا ہے اور معلول کی پیدائش بھی

علّت کے تمام نمونوں اور اندازوں کے مطابق ہے جو علتِ تامّہ نے اس کے لئے معیّن کر رکھے ہیں مثلاً وہ وجوہات یا علل جو انسان کے لئے سانس لینے کا باعث ہوتے ہیں وہ مکمل تنفس کو پیدا نہیں کرتے بلکہ منہ اور ناک کے اردگرد ہوا کا ایک معیّن اندازہ، معیّنہ مکان و زمان اور شکل و صورت میں سانس کی نالی کے ذریعے پھیپھڑوں کے اندر بھیجتے ہیں اور وہ وجوہات اور علل جو دیکھنے کی قوت کو انسان کے لئے پیدا کرتے ہیں (اور انسان بھی انہی کا ایک جزء ہے) قوتِ دید کو بلا قید و شرط ثابت نہیں کرتے بلکہ اس نظر یا دید کو پیدا کرتے ہیں جو ان ذرائع کے سبب ہر طرح سے ایک خاص اندازے کے مطابق معیّن کی گئی ہے۔ یہ حقیقت، کائنات کے تمام مظاہر اور ان حوادث و واقعات میں بغیر کسی خلاف ورزی کے جاری ہے جو اس کائنات میں رونما ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں اس حقیقت کو "قدر" کہا ہے اور اس کو خدائے تعالیٰ سے منسوب کیا ہے جو تمام کائنات کا سرچشمہ ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ○ (سورہ قمر آیت ۴۹)

اور پھر فرماتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○ (سورۃ حجر آیت ۲۱) [1]

اور چونکہ قضائے الٰہی کے مطابق اس نظامِ کائنات میں ظاہر ہونے والا ہر حادثہ، واقعہ یا مظہر ضروری الوجود اور ناقابلِ اجتناب ہے، اسی طرح "قدر" کے مطابق ہر پیدا ہونے والا حادثہ یا مظہر اپنے اس معیّنہ اندازے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا جو خدائے تعالیٰ نے اسکے لئے معین کر رکھا ہے۔

انسان اور اختیار

انسان جو کام بھی کرتا ہے وہ اس کائنات کا مظہر ہے اور کائنات کے تمام مظاہر کی طرح

---

[1] امام ہشتم ؑ فرماتے ہیں: "جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو "تقدیر کرتا ہے" اور جب تقدیر کرتا ہے تو "قضا کرتا ہے" اور جب قضا کرتا ہے تو جاری کرتا ہے۔ (بحار الانوار۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۴)

اس کی پیدائش بھی ایک مکمل علت پر منحصر ہے لہٰذا اس امر کے پیش نظر کہ انسان بھی کائنات کا ایک جز ہے اور دنیا کے تمام دوسرے اجزاء کے ساتھ جسمانی تعلق رکھتا ہے، پس اس کے فعل اور کام میں دوسرے اجزا کو بے اثر نہیں سمجھا جا سکتا۔

مثلاً انسان جو روٹی کھاتا ہے اس کام کو کرنے کے لئے جیسا کہ ہاتھ، پاؤں، منہ، علم، طاقت اور ارادے کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح روٹی کا وجود اور اس کا دسترس میں ہونا، رکاوٹ کا نہ ہونا اور ایسے ہی دوسری مکانی اور زمانی شرائط بھی اس عمل کے لئے ضروری ہیں اور اگر ان تمام شرائط میں سے ایک شرط اور ذریعہ موجود نہ ہو تو فعل یا عمل کا انجام ہونا محال ہو جائے گا اور ان تمام شرائط اور ذرائع کی تکمیل (علتِ تامہ کے اثبات کے لئے) اس فعل اور عمل کے لئے ضروری ہیں۔

اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے علتِ تامہ کے مجموعی اجزاء کی نسبت، فعل کا ضروری ہونا، انسان کے ساتھ فعل کے منسوب ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ خود انسان علتِ تامہ کے اجزاء میں سے ایک ہے لہٰذا "علتِ امکان" ہے۔

انسان فعل کا امکان یا اختیار رکھتا ہے اور تمام اجزائے علت کی نسبت فعل کا ضروری ہونا، اس کے بعض اجزاء کی نسبت، جو انسان ہے، فعل کے ضروری ہونے کا باعث نہیں ہوگا۔

انسان کا سادہ اور بے آلائش و پاک ادراک بھی اس نظریئے کی تائید کرتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی خداداد فطرت اور قابلیت کے ساتھ، کھانے، پینے، آنے، جانے اور صحت، بیماری، بڑائی، چھوٹائی اور بلندی و پستی کے درمیان فرق کو جانتا ہے، اور پہلی قسم جو انسان کے ارادے اور خواہش کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتی ہے، انسان کے اختیار میں سمجھی جاتی ہے اور اس کی تعریف یا برائی بھی کی جا سکتی ہے، برخلاف دوسری قسم کے کہ اس میں انسان پر کسی قسم کا کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔

اسلام کے آغاز سے ہی اہلسنّت مذہب میں انسانی افعال کے بارے میں دو مذاہب یا نظریئے مشہور تھے۔ ایک جماعت اس لئے کہ انسان کے افعال خدا کی مرضی کے بغیر انجام نہیں پاتے اور ان کی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے۔ انسان کو اپنے افعال یا اعمال میں مجبور سمجھتے تھے اور انسانی اختیار و ارادے کو کوئی

اہمیّت نہیں دی جاتی تھی، لیکن ایک جماعت انسان کو اپنے افعال اور اعمال میں خود مختار جانتی تھی اور ان کو خدائی ارادے سے متعلق نہ جانتے ہوئے "قدر" کے دائرے سے خارج سمجھتی تھی۔

لیکن اہلبیتؑ کی تعلیم کے مطابق جو قرآن کی ظاہری تعلیم کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہے، انسان اپنے افعال میں خود مختار ہے، لیکن آزاد نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کے ذریعے انسانی فعل کو جاری کیا ہے اور ہماری پچھلی تعبیر کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے علّت تامہ کے تمام اجزاء کے ذریعے جن میں سے ایک انسان کا ارادہ اور اختیار بھی ہے، فعل کو جاری کیا ہے اور اس کو لازمی قرار دیتا ہے، جس کے نتیجے میں خدا کی یہ خواہش فعل کو ضروری اور انسان کو اس میں خود مختار بنا دیتی ہے، یعنی فعل اپنی علّت کے تمام اجزاء کی نسبت ضروری ہو جاتا ہے اور ان اجزاء میں سے ایک کی نسبت، جو انسان ہے، اختیاری اور ممکن ہو جاتا ہے۔

امام ششمؑ فرماتے ہیں: "نہ "جبر" ہے اور نہ ہی "قدر" بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک امر ہے"۔[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۵ اور امام ششمؑ سے روایت۔ بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۶، یزید شامی نے آٹھویں، چھٹے اور پانچویں اماموں سے نقل کیا ہے کہ: خدائے تعالیٰ اپنی کائنات کے ساتھ اس سے زیادہ مہربان ہے کہ پہلے تو اس کو گناہ کیطرف مجبور کرے اور پھر اس کو عذاب دے اور خدا تعالیٰ اس سے زیادہ عزیز ہے کہ ایک امر کو چاہے لیکن پھر اس کو نہ سنے۔"
اور پھر امام ششمؑ فرماتے ہیں: "خدا تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ انسانوں پر اس کام کو فرض کرے جس کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور اس سے کہیں بڑا ہے کہ اس کی کائنات میں وہ امر یا حادثہ پیدا ہو جائے جسے وہ نہ چاہتا ہو۔"
(بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۱۵۔ جبر اور قدر (تفویض) کے نظریات کی طرف اشارہ ہے)

پیغمبر شناسی

(پیغمبروں کی پہچان)

- مقصد کی طرف ۔ عمومی ہدایت ۔
- خصوصی ہدایت ۔
- عقل اور قانون
- وہ مرموز قانون جس کو "وحی" کہا جاتا ہے ۔
- پیغمبر اور نبوت کی عصمت ۔
- پیغمبر اور آسمانی دین ۔
- پیغمبر اور وحی و نبوت کی حجّت ۔
- خدا کے پیغمبروں کی تعداد ۔
- اولوالعزم صاحب شریعت پیغمبر ۔
- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ۔
- پیغمبر اکرم ؐ اور قرآن مجید

ہدف کی طرف، عمومی ہدایت

گندم کا دانہ جو مٹی کے اندر خاص شرائط کے ساتھ بویا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ رشد و نمو کرتا ہوا انقلاب کی شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے اور ہر لحظہ اپنی شکل اور حالت بدلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اپنا فطری راستہ طے کرتا ہوا مکمل پودا اور بوٹا بن جاتا ہے جس کے

کئی خوشے (بالیاں) ہوتے ہیں اور اگر اس پودے کا ایک دانہ زمین پر گرے تو وہ بھی اپنا راستہ طے کرتا ہوا یہی حالت اختیار کرے گا اور اگر ایک پھل کی گٹھلی ہے تو وہ بھی زمین میں اپنی حرکت آغاز کر کے اپنے خول یا چھلکے کو پھاڑتی ہوئی سبز کونپل نکالتی ہے اور پھر منظم اور مشخص راستے کو طے کرتی ہوئی آخر کار ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے پتے سبز اور پھل میٹھے ہوتے ہیں۔

اگر حیوان یا انسان کا نطفہ ہے تو انڈے یا ماں کے رحم کے اندر ارتقاء پیدا کر کے ایک معیّن راستے یا منزل کو طے کرتا ہوا جو اس حیوان کے نطفے کے لئے مخصوص ہے وہی کامل انسان یا حیوان بن جاتا ہے۔

یہی معیّن اور مشخص طریقہ، ہر قسم کی پیدائش اور فطرت کے لئے، جو اس دنیا میں موجود ہے قائم اور جاری ہے اور اپنی فطرت میں اپنی ہی خاص قسم کے مطابق ہو گا یعنی گندم کا سبز پودا اپنے دانے سے شروع ہو کر ہرگز بھیڑ یا بکری نہیں بن سکتا اور مادّہ حیوان جو اپنے نر حیوان سے حاملہ ہوتا ہے ہرگز گندم کی بالی یا چنار کا درخت پیدا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اگر اعضاء کی ترکیب میں کسی قسم کا نقص پیدا ہو جائے اور یا بچے کے قدرتی ارتقائی عمل میں کوئی کمی بیشی واقع ہو جائے مثلاً ایک بھیڑ کا بچہ اندھا پیدا ہو یا گندم کے پودے پر بالیاں نہ لگیں تو ہمارے لئے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔ یہ سب کچھ کسی بیماری کی وجہ سے ہو گیا ہے یا بعض مخالف عناصر اور عوامل کے سبب ایسا ہوا ہے (ورنہ اسکی فطرت ایسی نہیں تھی)

اشیاء کی تبدیلی اور پیدائش میں دائمی نظم و نسق اور ہر قسم کی پیدائش اور فطرت میں خاص قسم کا ارتقاء ایک دانشور محقق کیلئے ناقابلِ انکار بات ہے۔ اس واضح نظریئے سے دو اور نتیجے حاصل کئے جا سکتے ہیں :۔

۱۔ ہر قسم کی مخلوق اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر جو تمام مراحل طے کرتی ہے اس میں ایک رابطہ اور تعلق و اتصال موجود ہوتا ہے مثلاً مذکورہ بالا تمام چیزیں اپنی جسمی تبدیلی اور ارتقاء کے دوران مختلف مراحل سے گزرتی ہیں اور ان کے آگے بھی بہت سے مراحل ہوتے ہیں جن کو اپنی زندگی میں طے کرتی ہیں۔

۲۔ مندرجہ بالا اشیاء کے اتصال و ارتباط کے پیش نظر ہر قسم کی مخلوق کا آخری مرحلہ اپنی پیدائش سے لے کر ارتقاء تک، اپنی ہی خاص قسم اور مخلوق کے دائرے کے اندر رہتا ہے، جیسا کہ اخروٹ

کا بیج جو مٹی کے نیچے سبز کونپل نکالتا ہے تو اس وقت سے لے کر اس کا ارتقاء ایک تنومند اخروٹ کے درخت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ایسے ہی انڈے یا ماں کے رحم میں بچہ بھی شروع ہی سے ایک مکمل حیوان یا انسان کی صورت ہے جو مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنی آخری شکل اور حد تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن مجید اپنی تعلیمات میں (جو تمام چیزوں کی پیدائش اور پرورش کو خدا سے منسوب کرتا ہے) ارتقاء اور مختلف مراحل سے گزرنے اور بڑھنے کو جو ہر قسم کی مخلوق اپنی ترقی کی راہ میں اپنے سامنے رکھتی ہے، اس کو خدا کی رہبری اور ہدایت سے منسوب کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے :

اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ○ (سورہ طٰہٰ آیت ۵۰)

وہ خدا جس نے ہر قسم کی مخلوق کو ایک خاص قسم کی پیدائش اور فطرت عطا کی ہے اور اس کے بعد اس کو ہدایت کی ہے (زندگی اور فطرت کے مقاصد کی طرف)

اور پھر فرماتا ہے : اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○ (سورہ اعلیٰ آیت ۲-۳)

ترجمہ : جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا اور درست کیا اور جس نے (اس کا) اندازہ مقرر کیا پھر راہ بتائی۔

اور ان آیات کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا ○ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۸)

ہر چیز کا ایک خاص مقصد، ہدف اور غرض و غایت ہے اور وہ ہمیشہ اس مقصد کے پیش نظر زندگی گزارتی ہے۔

پھر فرماتا ہے :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الدخان آیت ۳۸-۳۹)

ترجمہ : اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر (بے مقصد) پیدا نہیں کیا ہے بلکہ حقیقت اور فطرت (ہدف، مقصد اور غرض و غایت) پر پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔

خصوصی ہدایت

ظاہر ہے کہ انسان بھی ان کلیّات سے مستثنیٰ نہیں ہے اور یہی تکوینی ہدایت (ارتقائی ہدایت) ہے جو تمام کائنات اور انسان میں بھی حکومت کرتی ہے اور جیسا کہ ہر چیز اپنی خاص اصلیت کے ساتھ کمال اور ارتقاء کی طرف گامزن ہے اور مختلف مراحل میں ہدایت پیدا کرتی رہتی ہے، انسان بھی اپنی اصلی اور تکوینی ہدایت کے ساتھ کمال اور بلندی کی طرف ہدایت حاصل کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ انسان بہت زیادہ خصائص میں دوسری تمام حیوانی اور نباتاتی کائنات کے ساتھ شریک ہے، مگر اس میں ایک خصوصی خاصیّت بھی موجود ہے جو دوسری چیزوں سے اس کو جدا اور ممتاز کرتی ہے، اور وہ ہے ــــ "عقلِ انسانی"۔

عقل کے ساتھ انسان غور و فکر کرتا ہے اور اسی کے ساتھ تمام ذرائع سے اپنے فائدے کے لئے استفادہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے آسمانوں کی بیکران فضا میں بلندی حاصل کرتا ہے اور سمندروں کی گہرائیوں میں تیرتا ہے اور زمین میں تمام جمادات، نباتات اور حیوانات سے استفادہ کرتا ہے اور ان کو کام میں لاتا ہے حتیٰ کہ اپنے ہم جنسوں سے بھی حتی الامکان فائدہ اٹھاتا ہے۔

انسان اپنی فطری خاصیّت اور عادت کے مطابق اپنی سعادت اور بہتری کو مکمل آزادی میں ہی دیکھتا ہے، لیکن چونکہ اس کی جسمی تنظیم ایک اجتماعی تنظیم ہے اور بے شمار ضروریات رکھتا ہے، جن کے پیشِ نظر ہرگز اکیلا ان تمام ضروریات اور احتیاجات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اجتماعی طور پر اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر، کہ وہ بھی اسی طرح کی ضروریات مثلاً خود غرضی، آزادی اور دوستی کی خواہشات رکھتے ہیں ناگزیر اور مجبور ہے کہ اپنی آزادی کا کچھ حصہ اس راہ میں دوسروں کے لئے وقف کردے اور اس کے برابر دوسروں کی کمائی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھائے اور اسی طرح اپنی کمائی سے دوسروں کو بھی حصہ دے یعنی سماجی تعاون کو مجبوری کی خاطر قبول کرلیتا ہے۔

یہ حقیقت بچوں اور نابالغوں کے حالات پر نظر ڈالنے سے اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے، چھوٹے بچے شروع میں جب کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو زور اور رونے پر تکیہ کرتے ہیں اور کسی قانون

یا اصول کو ہرگز قبول نہیں کرتے، لیکن جب ان کی عقل میں اضافہ ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ سمجھ جاتے ہیں کہ زندگی کے کام کاج صرف زور اور سرکشی کے ساتھ ہی انجام نہیں پاتے۔ اس طرح بتدریج ایک سماجی انسان کی حالت اختیار کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ ایک اجتماعی شخص کی عمر کو پہنچ کر، جو مکمل عقل اور غور و فکر رکھتا ہے اپنے ماحول کے اندر تمام سماجی اصولوں اور قوانین کے مطیع بن جاتے ہیں۔ انسان، تعاونی معاشرے کو قبول کرنے کے لئے قانون کو ضروری جانتا ہے کہ جو معاشرے میں حکومت کرے اور ہر شخص کے فرائض کو معیّن کرتے ہوئے خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزا معیّن کرے، یعنی ایک ایسا قانون جس کے عملی نفاذ کے ذریعے معاشرے کے تمام افراد حقیقی سعادت کو حاصل کریں اور وہ خوشحالی جو ان کی اجتماعی اقدار کے مطابق ہو، اس تک پہنچ جائیں۔

یہ قانون، عملی اور عمومی قانون ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر آج تک ہمیشہ اس کا خواہاں اور شیفتہ رہا ہے اور ہمیشہ اس کو حاصل کرنے کی آرزو اور خواہش کرتا رہا ہے اور اس کو پانے کی کوشش میں ہے، ظاہر ہے کہ اگر ایسی چیز ممکن نہ ہوتی اور انسان کی تقدیر میں لکھی ہوئی نہ ہوتی تو انسان ہمیشہ اس کی خواہش نہ کرتا۔[1]

خداوند تعالیٰ نے اس انسانی معاشرے کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط (سورہ زخرف آیت ۳۲)

---

[1] دنیا کے تمام انسان حتیٰ کہ ان میں سے بہت ہی سادہ اور بے فکر لوگ بھی اپنی فطرت کے مطابق چاہتے ہیں کہ یہ انسانی دنیا ایسی ہو جائے کہ تمام انسان اس میں صلح و صفا اور آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ فلسفے کے مطابق "چاہنا۔ خواہش کرنا۔ رغبت کرنا اور بھوک وغیرہ" ایسی صفات ہیں جن کو اضافی اور ارتباطی کہا جاتا ہے اور ان کا وجود دو طرفہ ہوتا ہے۔ مثلاً چاہنے والا اور جس کو چاہا جائے یا عاشق و معشوق وغیرہ اور ظاہر ہے کہ پسند کرنے یا عاشق ہونے کا امکان نہ ہوتا تو عاشق ہونا یا پسند کرنا کوئی معنی یا حقیقت نہ رکھتا اور آخر کار ہر ایسا نظریہ "ادراکِ نقص" کی طرف واپس نہ لوٹتا کیونکہ اگر کمال یا عروج و ترقی ممکن نہ ہوتے تو نقص یا پستی کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

[1] انسانی خودغرضی اور اجارہ داری کی خواہش کے متعلق فرماتا ہے :-
اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ [2] (سورۃ المعارج آیت ۱۹-۲۱)

عقل اور قانون

اگر اچھی طرح سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ قانون جس کی انسان ہمیشہ آرزو اور خواہش کرتا رہا ہے اور سبھی لوگ انفرادی طور پر یا مجموعی طور پر اپنی خداداد فطرت کے ساتھ ایسے قوانین کی خواہش اور ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ان کی سعادت اور خوش بختی کو پورا کر سکیں۔ یہ وہی قانون ہے جو انسانی دنیا کو انسانی دنیا ہونے کے طور پر کسی استثناء اور امتیاز کے بغیر سعادت تک پہنچاتا ہے اور یہی قانون تمام افراد کے درمیان عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اب تک انسانی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور مختلف زمانوں میں وہ قانون جو عقل و خرد کے مطابق بنایا گیا ہو، لوگوں نے اس کو نہیں سمجھا ہے اور اگر ایسا قانون فطرت کے مطابق اور تکوینی ہدایت کی طرف سے عقل کے سپرد کیا گیا ہوتا تو یقیناً ہر عقلمند انسان اس کو مکمل طور پر سمجھ سکتا تھا بلکہ وہ لوگ جو عقل رکھتے ہیں ایسے قانون کو اچھی طرح تفصیل سے سمجھ سکتے تھے جیسا کہ معاشرے میں ایسے قانون کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ وہ مشترکہ مکمل قانون جو اس انسانی معاشرے کی خوشحالی اور خوش نصیبی

---

[1] ہم نے معیشت اور زندگی کو انسانوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے (ہر متکفل شخص بھی اسی معیشت کا حصہ ہے) اور ان میں سے بعض کو برتری دی ہے تاکہ ان میں سے بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کو مسخر کریں (ان پر غلبہ حاصل کریں) جیسا کہ ہر مزدور یا حاکم خاص موقعوں پر دوسروں کو مسخر کرتے ہیں اور اسی طرح افسر اور ماتحت، مالک اور مزارعہ یا خریدار اور بیچنے والا۔

[2] بیشک انسان حریص اور لالچی پیدا ہوا ہے، جب اس کو شر (مصیبت) اور ناگواری کی بو مس کرتی ہے (نقصان اٹھاتا ہے) تو جزع (بے صبری اور گریہ و زاری) کرتا ہے اور جب اس کو فائدہ ہوتا ہے تو دوسروں کو اس سے منع کرتا ہے (دوسروں کو اس میں شریک اور حصہ دار نہیں بناتا)

کو پورا کرے اور اس کے ذریعے انسان، فطرت اور حقیقی راستے کی طرف ہدایت حاصل کر سکے، اگر قدرتی اور فطری طور پر عقل کے ذمّے لگایا گیا ہوتا تو ہر عقلمند انسان اس کو ضرور سمجھ سکتا تھا جیسا کہ نفع، نقصان اور اپنی زندگی کی تمام دوسری ضروریات کو سمجھتا ہے، لیکن ایسے قانون کا آج تک کہیں سراغ نہیں ملتا، اور وہ قوانین جو خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا ان کو کسی حکمران نے یا افراد اور قوموں نے بنایا ہے، اور آج انسانی معاشرے میں جاری اور نافذ ہیں، وہ سب کے سب ایک جماعت کے لئے فائدہ مند ہیں اور دوسری جماعت کے لئے نہیں ہیں۔ ایک جماعت ان قوانین سے مطلع ہے اور دوسری نہیں جانتی، لہٰذا تمام انسان جو انسانی لحاظ سے مساوی ہیں اور سب کے سب خداداد عقل رکھتے ہیں، ان قوانین کے بارے میں مشترکہ سوجھ بوجھ یا عقیدہ نہیں رکھتے۔

وہ مرموز شعور جسے وحی کہا جاتا ہے

گزشتہ بیان کے ذریعے واضح ہو گیا ہے کہ ایسا قانون جو انسانی سعادت اور خوش بختی کو پورا کرنے کی ضمانت دے سکے، عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہے اور چونکہ "عمومی ہدایت" کے نظریئے کے مطابق انسانوں میں ایسی سوجھ بوجھ کا ہونا ضروری ہے تاکہ ایسے قانون کو سمجھ سکیں، پس ضروری ہے کہ انسانوں میں ایسے قانون کو سمجھنے کے لئے ایک مقیاس، پیمانہ یا آلہ ہونا چاہیئے جو زندگی کے حقائق و فرائض کو اچھی طرح بیان کر سکے اور سب کی دسترس میں قرار دے اور اس شعور و ادراک کو جو ظاہری عقل و شعور اور احساس کے علاوہ ہے "شعورِ وحی" کہا جاتا ہے، البتہ ہر انسان میں ایسی طاقت کا پیدا ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ ایسی طاقت تمام انسانوں میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً قوتِ باہ تمام انسانوں میں موجود ہے لیکن شادی کی لذّت کو سمجھنا اور شادی کرنا صرف اسی وقت میسّر آ سکتا ہے جب انسان سنِ بلوغ کو پہنچ جائے، اسی طرح وحی کا شعور ان افراد میں جو اس کو نہیں سمجھتے "مرموز" چیز ہے، بالکل اسی طرح جیسا کہ نابالغ افراد کے لئے شادی کی لذّت کو سمجھنا مرموز ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں خصوصاً اپنی شریعت کی وحی اور اس کو سمجھنے میں عقل کی نارسائی کے بارے

میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ
..... رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ
حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ (سورۃ النساء آیت ۱۶۳-۱۶۵)

ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جیسا کہ نوحؑ اور نوحؑ کے بعد آنے والے تمام پیغمبروں پر وحی نازل کی۔ وہ پیغمبر جو انسانوں کو خوشخبری سناتے تھے اور خدا سے ڈراتے تھے تاکہ پیغمبروں کو بھیجنے کے بعد لوگوں کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے کہ اگر خدا کو پہچاننے کے لئے عقل کافی ہوتی تو اس کام کیلئے پیغمبروں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

پیغمبر اور نبوّت کی عصمت

خدا کے پیغمبروں کا ظہور جیسا کہ گزشتہ فصل میں بیان ہوا ہے "نظریۂ وحی" کی تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ خدا کے پیغمبر ایسے انسان تھے جنہوں نے وحی اور نبوت کی دعوت اور تبلیغ کی اور اپنے دعوے کے بارے میں قاطع دلیل لاتے تھے اور خدا کے دین کے تمام پہلوؤں کو جو کہ سعادت اور خوشحالی بخشنے والا خدائی قانون ہے، لوگوں کو بتاتے تھے اور خاص و عام کی دسترس میں پہنچاتے تھے۔ اور چونکہ پیغمبر، وحی اور نبوّت کے مالک تھے اس لئے جب بھی وہ اس دنیا میں تشریف لاتے اور ظاہر ہوتے تو ان کی تعداد بیک وقت ایک یا چند افراد سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کو پیغمبروں کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مکمل کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کا ہر پیغمبر عصمت و طہارت کی صفت سے متصف ہونا چاہئے یعنی خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے اور اس کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے پیغمبر کو ہر خطا اور غلطی سے پاک ہونا چاہئے۔ اس کو گناہ (قانونِ خدا کی خلاف ورزی) نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے وحی کے معنی، اس کی حفاظت اور تبلیغ کے تین مراحل یا ارکان ہیں جو فطری

ہدایت پر مبنی ہیں اور فطرت میں کسی قسم کی غلطی یا خطا کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دعوت و تبلیغ کے دعویدار (یعنی دعوت دینے والے) کی طرف سے ہر قسم کی غلطی یا خلاف ورزی خود مقاصدِ دعوت کے برعکس اور برخلاف اقدام ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تبلیغ کی درستی اور حقیقت کے متعلق لوگوں کا یقین اور وثوق اٹھ جائے اور اسی طرح آخرکار اس تبلیغ اور دعوت کے مقصد اور غرض و غایت کو تباہ و برباد کرنے کا موجب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں پیغمبروں کی عصمت و طہارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (سورۃ الانعام آیت ۸۷) [1]

اور پھر فرماتا ہے:۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○ لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (سورۃ الجن آیات ۲۶-۲۸) [2]

پیغمبر اور آسمانی دین

جو کچھ خدا کے پیغمبروں کو وحی کے ذریعے حاصل ہوا اور انہوں نے پیغام و نصیحت کے طور پر انسانوں تک پہنچایا اس کو "دین" کہتے ہیں، یعنی زندگی کا طریقہ اور انسانی قوانین و فرائض جو انسان کی [3]

---

[1] ہم نے پیغمبروں کو اپنے پاس جمع کیا (یعنی وہ ہمارے بغیر کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے اور نہ ہی اطاعت کرتے ہیں) اور ان کو ٹھیک راستے پر چلا دیا ہے۔

[2] صرف وہی (خدا تعالیٰ) غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے علم غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا، مگر اپنے پسندیدہ اور برگزیدہ بندوں کے سوا یعنی پیغمبروں کو، اور اس صورت میں آگے اور پیچھے سے ان (پیغمبر یا وحی) کی مکمل حفاظت کرتا ہے تاکہ خداوند تعالیٰ کے پیغامات بالکل اصلی حالت میں پہنچائیں۔

[3] اسی کتاب کے مقدمے کی طرف رجوع کریں۔

حقیقی سعادت کو پورا کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہر آسمانی دین دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی اعتقادی اور عملی، اعتقادی حصّہ ایسے بنیادی عقائد اور حقیقت بینی کے اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جن پر انسان کو اپنی زندگی کی بنیاد رکھنی چاہئے۔ اور وہ تین بنیادی اصول یا ارکان ہیں یعنی توحید، نبوّت، معاد (قیامت اور حساب کتاب کا دن) اگر ان تینوں میں سے ایک میں بھی شک پیدا ہو جائے یا کمی واقع ہو جائے تو دین کی پیروی نہیں ہو سکتی۔

دین کا عملی حصہ ایسے اخلاقی اور عملی فرائض پر مبنی ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان پر عائد کئے گئے ہیں اور انسان پر اس دنیا میں انسانی معاشرے کی طرف سے بھی عائد ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ فرعی فرائض جو آسمانی ادیان میں انسان کے لئے بنائے گئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں یعنی اخلاق[۱] اور اعمال[۲]، اور پھر یہ دونوں دو دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

اخلاق اور اعمال کا ایک حصہ وہ ہے جو صرف خداوند تعالیٰ سے متعلق ہے مثلاً خلق، ایمانی صفت، اخلاص، تسلیم و رضا اور خضوع و خشوع وغیرہ۔ اور ایسے ہی نماز، روزہ، قربانی وغیرہ۔ اس قسم کے اخلاق اور اعمال کو عبادت کہا جاتا ہے، خضوع و خشوع اور بندگی انسان کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور با اعتبار بناتے ہیں۔

نیک اعمال و اخلاق کا ایک حصہ وہ ہے جو معاشرے سے متعلق ہے مثلاً انسانوں سے محبت، خیر خواہی، انصاف، سخاوت، میل جول کے فرائض اور طریقے اور لین دین وغیرہ اور اس قسم کے اخلاق و اعمال کو "معاملات" (لین دین یا معاہدہ کرنا) کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف انسان ہمیشہ اور بتدریج ترقی و کمال کی طرف متوجہ ہے اور انسانی معاشرہ آہستہ آہستہ مکمل تر ہوتا جا رہا ہے، اس قسم کی تکمیل آسمانی شریعتوں اور ادیان میں بھی ضروری اور لازمی ہے اور قرآن کریم اس تدریجی ارتقاء کو (جیسا کہ عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے) تائید اور تصدیق کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے مستفاد ہوتا ہے، ایک شریعت یا دین کے بعد میں آنے والی شریعت یا دین

کو مکمل تر بیان کرتا ہے :

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ [1] (سورۃ المائدۃ آیت ۴۸)

البتہ جیسا کہ علمی نظریات اور عقائد سے پتہ چلتا ہے اور قرآن کریم بھی اس کی وضاحت کرتا ہے ۔ انسانی معاشرے کی زندگی، اس کائنات اور دنیا میں ابدی اور ہمیشگی نہیں ہے لہٰذا فطری طور پر اس قسم کا ارتقاء لامتناہی نہیں ہوگا۔ اسی طرح عمل اور اعتقاد کے لحاظ سے تمام انسانی فرائض مجبوراً ایک مقام یا مرحلے پر جاکر ٹھہر یا ختم ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں ایک دن نبوّت اور شریعت بھی عملی اصول کی توسیع اور اعتقاد کے ارتقاء کے لحاظ سے اپنی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہو جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اس موضوع کو واضح کرنے کے لئے کہ اسلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین تمام آسمانی ادیان سے مکمل تر اور آخری دین ہے۔ اپنے آپ کو ناقابلِ منسوخ کتاب اور حضرت محمدؐ کو آخری اور خاتم الانبیاء پیغمبر اور ایسے ہی دینِ اسلام کو تمام انسانی اور خدائی فرائض پر مشتمل بیان فرماتا ہے

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ [2] (سورۃ حٰم سجدہ آیت ۴۲)

اور پھر فرماتا ہے :-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ [3] (احزاب ۴۰)

اور پھر فرماتا ہے : وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ [4] (سورۃ النحل آیت ۸۹)

---

[1] اور ہم نے کتاب (قرآن) کو تم پر نازل کیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلی کتابوں (تورات اور انجیل وغیرہ) کو پیش نظر رکھتی ہے اور ان کی تصدیق کرتی ہے، لیکن ان پر تسلّط اور برتری رکھتی ہے۔

[2] اور یقیناً قرآن ایسی کتاب ہے جو بہت ہی پیاری اور کسی باطل چیز کو آگے یا پیچھے سے قبول نہیں کرتی بلکہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی (باطل اس کتاب میں راہ پیدا نہیں کر سکتا)

[3] محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ خدا کے رسول اور آخری پیغمبر (خاتم النبیین) ہیں۔

[4] اور ہم نے تمہاری طرف کتاب بھیجی ہے جو ہر چیز کو واضح کرنے والی ہے ۔

پیغمبر اور وحی و نبوّت کی حُجّت

موجودہ زمانے میں بہت زیادہ دانشور اور محقّق جنہوں نے وحی اور نبوّت کے بارے میں تحقیق کی ہے انہوں نے وحی، نبوت اور ان سے متعلّقہ مسائل کو معاشرے کے نفسیاتی اصول کے ساتھ توجیہہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبر پاک فطرت، بلند ہمّت اور خلائق دوست انسان ہیں جنہوں نے انسانوں کی مادّی اور معنوی ترقی اور بُرے معاشروں کی اصلاح کے لئے قوانین بناتے ہیں اور لوگوں کو ان کی طرف دعوت دی ہے۔ چونکہ اس زمانے کے لوگ عقل اور منطق کو قبول نہیں کرتے تھے اس لئے انہوں نے لوگوں کی اطاعت اور فرمانبرداری حاصل کرنے کے لئے ان قوانین کو عالم بالا (خدا) سے منسوب کر دیا ہے اور اپنی پاک روح کو روح القدس اور اس سے حاصلہ افکار کو وحی و نبوّت اور مطلوبہ فرائض کو آسمانی یا خدائی شریعت کہا جاتا ہے اور جن بیانات اور کلام کے ذریعے یہ تمام امور بتائے جاتے ہیں ان کو کلامِ خدا یا "آسمانی کتاب" کہا ہے۔

جو شخص پورے انصاف کے ساتھ آسمانی کتابوں اور خصوصاً قرآن مجید میں گہرے غور و فکر سے اور اسی طرح پیغمبروں کی شریعتوں میں توجہ کرے، بلاشک و شبہ اسے معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ ٹھیک نہیں کہ خدا کے پیغمبر سیاستدان نہیں تھے بلکہ وہ مردانِ حق تھے اور ان میں سراپا صدق و صفا موجود تھا۔ وہ جس چیز کو سمجھتے تھے اس کو کسی کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، اور جو کچھ فرماتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے اور جس چیز کا دعویٰ کرتے تھے وہ ایک مرموز شعور تھا جو غیبی امداد کے ساتھ ان تک پہنچا تھا اور اس کے ذریعے انسانوں کے عمل اور اقتصادی فرائض خداوند تعالیٰ سے حاصل کر کے لوگوں کے درمیان اس کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دعویٰ نبوّت کو ثابت کرنے کے لئے حجّت، دلیل اور ثبوت ضروری ہے۔ اور اگر وہ شریعت جو ایک پیغمبر لاتا ہے وہ عقل کے مطابق ہو تو دعوائے پیغمبری کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ جو شخص پیغمبری اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنی شریعت کے حقیقی ہونے

کے دعوے کے علاوہ ایک اور دعویٰ بھی کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وحی و نبوت کے ذریعے عالمِ بالا سے تعلق اور رابطہ رکھتا ہے اور وہ خدا کیطرف سے بھیجا گیا ہے۔ اور یہ دعویٰ بجائے خود ثبوت اور دلیل چاہتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ (جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے) ہمیشہ لوگ اپنے سادہ اذکار اور ذہنوں کے ساتھ خدا کے پیغمبروں سے ان کے دعویِ نبوت اور پیغمبری کو ثابت کرنے کے لئے معجزے چاہتے تھے۔

اس سادہ اور ٹھیک منطق کے معنی یہ ہیں کہ وہ وحی اور نبوّت جن کا ایک پیغمبر یا نبی دعویٰ کرتا ہے اور تمام دوسرے انسانوں میں جو اس کی طرح انسان ہیں یہ بات موجود نہیں ہے، مجبوراً اس کو ایک ایسی غیبی طاقت ماننا پڑے گا جو خدا کی طرف مافوق الفطرت ذرائع سے پیغمبر کو ملتی ہے اور پیغمبر اس کے ذریعے سے خدا کے کلام کو سن کر اپنی رسالت کے مطابق اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ اگر یہ سب ٹھیک ہے، تو پیغمبر کو چاہئے کہ اپنے خدا سے ایک دوسری مافوق الفطرت چیز مانگے اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کرے تاکہ لوگ اس کے ذریعے پیغمبر کی پیغمبری اور نبی کی نبوّت و صداقت پر ایمان لے آئیں۔

جیسا کہ معلوم ہے پیغمبروں سے معجزے کی درخواست ایک ٹھیک اور درست منطق کے مطابق ہے اور خدا کا پیغمبر اپنی نبوّت کے اثبات کے شروع ہی میں یا لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ دکھائے۔ اور قرآن کریم بھی اس منطق کی تائید اور تصدیق کرتا ہے اور اس طرح بہت زیادہ پیغمبروں کے معجزوں کو بیان کرتا ہے جو انہوں نے اپنی نبوّت کے آغاز میں یا لوگوں کی درخواست کے بعد دکھائے ہیں۔

البتہ بہت سے محقّقین نے معجزے (مافوق الفطرت) سے انکار کیا ہے لیکن ان کے دلائل اور کلام ٹھوس نہیں ہیں اور علل و اسباب جو موجودہ زمانے تک ہونے والے حوادث و واقعات کے بارے میں تجربے اور تحقیق کے ذریعے ہمیں معلوم ہوئے ہیں، ان کے متعلق ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ آیا یہی اسباب دائمی ہیں اور ان کے علاوہ ہرگز کوئی اور سبب یا حادثہ کسی اور طرح سے یا دوسرے علل و اسباب کے ذریعے رونما نہیں ہوسکتا؟ اور وہ معجزات جن کو پیغمبروں نے خدا سے منسوب کیا ہے، محال اور عقل کے خلاف نہیں ہیں (جیسا کہ تین کا عدد جفت نہیں ہوسکتا) بلکہ خارق العادت یا مافوق الفطرت ہیں، حالانکہ یہ خارق العادت یا کرامات ریاضت اور مجاہدہ کرنے والے افراد سے بہت زیادہ دیکھی اور سنی گئی ہیں۔

خدا کے پیغمبروں کی تعداد

تواریخ کے مطابق بہت زیادہ پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے ہیں اور قرآن مجید میں ان میں سے اکثر اور بہت زیادہ پیغمبروں کی تصدیق کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک جماعت کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن تمام پیغمبروں کی حقیقی اور مشخص تعداد کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔

کسی قطعی یا حتمی کتاب میں بھی پیغمبروں کی حقیقی تعداد بیان نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ حضرت ابوذر غفاری کی مشہور روایت یا حدیث میں جو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کی ہے۔ لکھا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار معین ہوئی ہے۔

اولوالعزم صاحبِ شریعت پیغمبر

قرآن کریم کے مطالب سے حاصل ہونے والے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے تمام پیغمبر شریعت نہیں لائے ہیں بلکہ ان میں سے صرف پانچ پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰؐ ہی اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں اور دوسرے تمام پیغمبر شریعت میں ان اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳)

اور پھر فرماتا ہے:۔

لہ خداوند تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی دین کی شریعت بھیجی ہے جو نوحؑ پر نازل کی تھی اور جو تم پر نازل کی ہے اور جو ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر نازل کی تھی۔

(یہ آیت مہربانی اور امتنان کا درجہ رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ان پیغمبروں کے علاوہ کوئی اور پیغمبر بھی صاحبِ شریعت ہوتا تو اس کا ذکر بھی اس آیت میں ہوتا)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرَاهِيْمَ
وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (احزاب آیت ۷)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوّت

خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو صاحب کتاب و شریعت ہیں اور مسلمان آپؐ پر (اور آپؐ کی پیغمبری کے مقاصد پر) ایمان لائے ہیں۔

آنحضرتؐ سنہ ہجری قمری شروع ہونے سے پچاس سال پہلے حجاز کے شہر مکّہ کے بنی ہاشم خاندان میں جو خاندانِ قریش میں سب سے باعزت گھرانہ تھا، پیدا ہوئے۔

آپؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہ تھے۔ آپؐ ابھی بچے ہی تھے کہ والد ماجد اور والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد آپؐ اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کی سرپرستی میں آگئے۔ حضرت عبدالمطلب بھی جلد ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، لہٰذا آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب نے آپؐ کی سرپرستی اور دیکھ بھال اپنے ذمّے لی اور آپؐ کو اپنے گھر لے گئے۔

آنحضرتؐ نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کے گھر پرورش پائی اور بڑے ہوئے۔ ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ اپنے چچا کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام تشریف لے گئے۔

آپؐ نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا لیکن سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد آپؐ باعقل، باادب اور امانت دار مشہور ہو گئے تھے۔ عقل و امانت کے نتیجے میں ہی خاندانِ قریش کی دولت مند خاتون (خدیجہ) نے آپؐ کو اپنے مال کا سرپرست بنا دیا تھا۔ اسی طرح تجارت اور لین دین کے تمام کام آپؐ کے سپرد کر دیئے تھے۔

آنحضرتؐ نے مالِ تجارت کے ساتھ دو بار شام کا سفر کیا اور اپنی عقل و دانش کے ذریعے بہت

---

۲ اور جب تم نے پیغمبروں سے وعدہ کر لیا تھا (بیعت کر لی تھی) اور تم سے اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ (علیہم السلام) سے بھی وعدہ لیا تھا۔

زیادہ منافع حاصل کیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس خاتون نے آنحضرتؐ کو شادی کی پیشکش کی اور آپؐ نے بھی یہ پیشکش قبول کرلی۔ شادی کے بعد سے جو پچیس۲۵ سال کی عمر میں ہوئی، چالیس سال کی عمر تک آپؐ یہی کام کرتے رہے۔ آپؐ نے عقلمندی اور امانتداری میں بہت زیادہ شہرت حاصل کرلی تھی، لیکن آپؐ بتوں کی پوجا نہیں کیا کرتے تھے (اگرچہ اس زمانے میں عرب کا عام مذہب بت پرستی تھا) اور کبھی کبھی خلوت اور تنہائی میں جاکر اپنے خدا سے راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر تک (مکہ معظمہ کے نزدیک تہامہ پہاڑوں کے اندر ایک غار) غارِ حرا میں جاکر تنہائی میں خدا کی عبادت کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ خدائے تعالیٰ کی طرف سے نبوّت کے لئے منتخب ہوئے اور آپؐ کے ذمے تبلیغ کا کام لگا دیا گیا۔ اس طرح قرآن مجید کی پہلی سورت (سورۂ علق) آپؐ پر نازل ہوئی۔ اسی دن آپؐ اپنے گھر تشریف لائے اور راستے میں اپنے چچازاد بھائی حضرت علی ابن ابیطالب کو دیکھا اور تمام واقعہ بیان کیا۔ حضرت علی فوراً آپؐ پر ایمان لے آئے اور جب آپؐ گھر کے اندر تشریف لائے تو آپؐ کی بیوی (حضرت خدیجہؑ) بھی آپؐ پر ایمان لے آئیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے جب پہلی بار لوگوں کی ایک جماعت کو دینِ اسلام کی دعوت دی تو آپؐ بہت ہی شدید اور دردناک ردِّ عمل سے دوچار ہوئے، لہٰذا مجبوراً ایک عرصے تک پوشیدہ اور خفیہ طور پر تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ خدا کی طرف سے آپؐ کو حکم ملا کہ اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو دین اسلام کی طرف بلائیں۔ لیکن اس تبلیغ کا بھی کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ نکلا اور حضرت علی ابن ابیطالب کے سوا کوئی شخص مسلمان نہ ہوا (لیکن آئمۂ اہلبیت کی دستاویزات، اسناد و احادیث اور ایسے ہی حضرت علی کے اشعار کے حوالے سے شیعہ معتقد ہیں کہ ابوطالب ایمان لے آئے تھے مگر چونکہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے اکیلے حامی تھے اس لئے اپنے دین (اسلام) اور ایمان کو لوگوں سے چھپا کر رکھتے تھے تاکہ قریش میں اپنی ظاہری طاقت کو محفوظ رکھ سکیں) اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے خدا کے حکم کے مطابق اپنی تبلیغ کا کام اعلانیہ شروع کردیا۔ اس اعلانیہ تبلیغ کے ساتھ اہلِ مکہ کی طرف سے شدید ردِّ عمل، آزار، شکنجے اور دوسری تکالیف شروع ہوگئیں جو آپؐ اور آپؐ کے پیروکار دوسرے نئے مسلمانوں پر روا رکھی جاتی تھیں

قریش کی طرف سے سختیاں اور تکلیفیں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ بہت سے مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور پیغمبر اکرمؐ اپنے چچا حضرت ابوطالب اور بنو ہاشم خاندان کے دوسرے افراد اپنے رشتہ داروں کے ساتھ شعب ابوطالب میں (جو مکّہ کی ایک وادی میں ایک قلعہ تھا) محصور ہو گئے اور نہایت ہی سختی اور تنگی کی حالت میں زندگی گزارتے رہے۔ قریش خاندان میں سے کوئی شخص بھی ان سے میل جول اور لین دین نہ رکھتا تھا اور نہ ہی آپؐ اس قلعے سے باہر آنے کی طاقت رکھتے تھے۔

اگرچہ مکّہ کے بت پرست اور مشرک لوگ ہر قسم کے دباؤ، شکنجے، مارنے پیٹنے، توہین، مذاق، رکاوٹ ڈالنے اور ہر قسم کی دوسری تکالیف دینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور کبھی کبھی آپؐ کو اسلام کی تبلیغ اور دعوت سے ہٹانے کے لئے نرم رویّہ اختیار کرتے ہوئے آپؐ کو بہت زیادہ مال و دولت، سلطنت، امارت وغیرہ کا وعدہ بھی دیتے تھے لیکن آنحضرتؐ کی نظر میں ان لوگوں کے وعدے اور تکلیفیں برابر تھے اور یہ سب چیزیں آپؐ کی ہمّت، آپؐ کے ارادے اور فیصلے میں اضافہ کرتی تھیں۔

ایک دفعہ بت پرست لوگ آپؐ کے پاس آئے اور انہوں نے بہت زیادہ مال و دولت، امارت اور سلطنت کا وعدہ دیا تو آنحضرتؐ نے مثال کے طور پر ان سے فرمایا: "خدا کی قسم، جس کے ہاتھ اور اختیار میں میری جان ہے۔ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو، تو بھی خداوند تعالےٰ کی پرستش، اطاعت اور اپنے مشن سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا۔"

آنحضرتؐ اپنی بعثت کے تقریباً دسویں سال میں شعب ابیطالب سے باہر آئے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے اور اسی طرح آپؐ کی وفادار بیوی حضرت خدیجہ بھی فوت ہو گئیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے لئے کوئی پناہ گاہ اور امن کی جگہ نہ رہی۔ مکّہ کے بت پرستوں اور مشرکوں نے آپؐ کو قتل کرنے کا خفیہ منصوبہ بنایا اور رات کے وقت چاروں طرف سے آپؐ کے مکان کو گھیرے میں لے لیا تاکہ رات کے آخری حصے میں ایک حملہ کر کے آپؐ کو بستر مبارک پر ہی قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس واقعے کی اطلاع دے دی اور حکم دیا کہ یثرب (مدینے) کی طرف

ہجرت کر جائیں۔ آپؐ نے حضرت علی کو اپنے بستر مبارک پر سونے کا حکم دیا اور خود خدا تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے گھر سے نکلے[1] اور دشمنوں کے محاصرے میں سے گزر کر مکّہ سے چند فرسخ[2] کے فاصلے پر ایک غار میں پناہ لی۔ تین رات دن تک دشمن آپؐ کی تلاش میں لگے رہے اور جب آپؐ کو گرفتار کرنے میں ناامید ہو گئے تو واپس مکّہ لوٹ گئے۔ تب آپ غار سے باہر نکلے اور یثرب (مدینہ منورہ) کی طرف روانہ ہو گئے۔

اہل یثرب کے بزرگ پہلے ہی آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے تھے اور آپ کی بیعت کر چکے تھے، انہوں نے آپ کا پُرجوش استقبال کیا اور اپنے جان و مال کو آپؐ کے اختیار میں دے دیا۔

آنحضرتؐ نے پہلی بار یثرب (مدینہ) میں ایک چھوٹے سے اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی اور مدینہ کے اردگرد سکونت رکھنے والے یہودی قبیلوں اور اسی طرح اس علاقے کے طاقتور عرب قبیلوں کے ساتھ بھی معاہدے کئے اور پھر اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح شہر یثرب "مدینۃ النبیؐ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اسلام دن بدن ترقی اور وسعت پیدا کر رہا تھا، مسلمان مکّہ میں قریش کے ظلم و ستم میں گرفتار تھے وہ آہستہ آہستہ اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے شمعِ رسالت کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو رہے تھے، ان کو "مہاجرین" کہا جاتا تھا، اسی طرح یثرب میں آنحضرتؐ نے جانداروں اور مددگاروں کو "انصار" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

اسلام بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود قریش کے بت پرست اور حجاز کے یہودی قبیلے رکاوٹوں اور جنگوں سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ ان منافقوں کے ساتھ مل کر جو مسلمانوں میں داخل ہو گئے تھے اور کسی طرح بھی پہچانے نہیں جاتے تھے، مسلمانوں کے لئے ہر روز ایک تازہ مصیبت

---

[1] جیسا کہ تواریخ میں لکھا ہے حضرت ابوبکر اس رات آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر کا غلام دو اونٹنیاں لئے شہر مکہ کے باہر آپ کا منتظر تھا۔ آپؐ اور ابوبکر اونٹنیوں پر سوار ہو کر غار ثور تک پہنچے کہ صبح ہونے والی تھی لہٰذا آپؐ نے اونٹنیوں اور غلام کو واپس کر دیا اور خود ابوبکر کے ساتھ غار میں چھپ گئے۔ جب دشمن مایوس ہو کر واپس چلے گئے تو آپؐ دونوں غار سے نکل کر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (مترجم)

[2] فرسخ چھ کلومیٹر کے برابر ہے۔

پیدا کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار جنگوں کی نوبت آئی اور مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان بہت سی جنگیں لڑی گئیں جن میں فتح اسلامی لشکر کو ہی نصیب ہوتی تھی۔ ان چھوٹی اور بڑی جنگوں کی تعداد اسّی (۸۰) سے زیادہ تھی، جن میں جنگِ بدر، جنگِ اُحد، جنگِ خندق اور جنگِ خیبر وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ ان تمام جنگوں میں اکثر خود موجود ہوتے تھے۔ تقریباً تمام بڑی خونی جنگوں اور ایسے ہی بہت زیادہ چھوٹے بڑے معرکوں میں حضرت علی کی وجہ سے ہی فتح ہوتی تھی، آپ ایسے شخص تھے کہ ان تمام جنگوں میں ہرگز پیچھے نہ رہتے تھے۔ ان تمام جنگوں میں جو ہجرت کے بعد دس سال کے عرصے میں لڑی گئیں مسلمانوں میں سے دو سو سے کمتر شہید ہوئے اور کافروں میں سے ایک ہزار سے کمتر مارے گئے۔

آنحضرتؐ کی کارکردگی، مہاجرین اور انصار کی فداکاریوں اور جان نثاریوں کی وجہ سے ہجرت کے بعد دس سال کے عرصے میں اسلام تمام جزیرۃ العرب میں پھیل گیا۔ اس مدّت میں دوسرے تمام ممالک مثلاً ایران، روم، مصر اور حبشہ وغیرہ کے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط بھی لکھے گئے۔

آنحضرتؐ غریبوں کے ساتھ غریبوں کی سی زندگی گزارتے تھے اور اپنی اس فقیری پر فخر کیا کرتے تھے[1] اور اپنی زندگی میں ایک لمحہ بھی بیکار نہ رہتے تھے۔ آپؐ نے اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ تو خدا کے لئے مخصوص تھا یعنی عبادات اور خدا کی یاد میں گزارتے تھے۔ دوسرا حصہ اپنے اہلِ خاندان اور گھر کی ضروریات کے لئے وقف تھا اور تیسرا حصہ لوگوں کے لئے تھا۔ اس حصے کو آپ معارفِ اسلامی کی تعلیم، اسلامی معاشرے کے کاموں اور اس کی اصلاح میں صرف کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ داخلی اور خارجی تعلّقات کو مضبوط بنانے اور دوسرے تمام مملکتی امور میں صرف کیا کرتے تھے۔

مدینہ میں دس سال قیام کے بعد آنحضرتؐ اس زہر کی وجہ سے جو ایک یہودی عورت نے آپؐ کے کھانے میں ڈال کر کھلایا تھا کمزور ہوتے گئے اور چند دن کی بیماری کے بعد آپؐ رحلت فرما گئے۔

---

[1] آپؐ کی مشہور حدیث ہے الفقر فخری۔ اس فصل کے مطالب کیلئے سیرت ابن ہشام، سیرت حلبی اور بحار الانوار جلد ۶ وغیرہ کی طرف رجوع کریں

جیسا کہ احادیث و روایات میں موجود ہے کہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے جو آخری الفاظ نکلے وہ عورتوں اور غلاموں کے (ساتھ بہتر سلوک کرنے کے) بارے میں وصیّت تھی۔

پیغمبر اکرمؐ اور قرآن مجید

عوام، دوسرے پیغمبروں کی طرح پیغمبر اکرمؐ سے بھی معجزہ طلب کیا کرتے تھے۔ اور آنحضرتؐ خود بھی پیغمبروں کے معجزات کی تصدیق فرماتے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ سے بھی بہت زیادہ معجزے رونما ہوئے اور ان میں سے بعض مسلّم اور قابل اعتماد ہیں۔ لیکن آپؐ کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ جو زندہ اور موجود ہے "قرآن کریم" ہے، جو آپؐ کی الہامی اور آسمانی کتاب ہے۔ یہ خدائی کتاب چھ ہزار سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک سو چودہ (۱۱۴) چھوٹی بڑی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ آنحضرتؐ کی تئیس ۲۳ سالہ نبوّت اور بعثت کے دوران بتدریج نازل ہوئی ہیں اور اس کی ہر آیت یا مکمل سورت رات، دن، سفر، حضر، جنگ، صلح یا مختلف سختی اور آسودگی کے زمانے میں وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے۔

قرآن مجید اپنی بہت زیادہ آیات میں واضح طور پر اپنے آپ کو معجزہ کہتا ہے اور تاریخی شہادت کے مطابق اس زمانے میں عرب کے لوگ جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ چکے تھے اور اپنی زبان کی مٹھاس اور روانی کی وجہ سے شعر و شاعری اور تحریر و تقریر کے میدان میں دادِ سخن دیا کرتے تھے، ان کو مقابلے کے لئے طلب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید ایک انسان کا ساختہ و پرداختہ ہے یعنی خود حضرت محمدؐ نے اس کو اپنی طرف سے بیان کیا ہے یا آپؐ نے کسی اور سے سیکھا ہے اور اس کی تعلیم حاصل کی ہے تو اس (قرآن) کی مانند[1] یا اس کو دس سورتوں کی

---

[1] جیسا کہ فرماتا ہے: فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (سورہ طور آیت ۳۴)
اگر وہ سچ کہتے ہیں تو قرآن کی مانند کلام لائیں۔

طرح[1] یا حتیٰ کہ ایک ہی سورت کی طرح[2] بنا کر لائیں اور اس کام کے لئے ہر ممکن ذرائع سے استفادہ کریں عرب کے نامور سخنوروں اور ادیبوں نے اس چیلنج کے مقابلے میں جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ یہ قرآن "جادو کی کتاب" ہے اور ہماری طاقت سے باہر ہے۔[3]

قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت کے ذریعے ہی چیلنج اور مقابلے کے لئے طلب نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی معنی کے لحاظ سے بھی مقابلے کی پیشکش کرتا ہے اور جنوں و انسانوں کی فکری اور علمی طاقت کو مقابلے کے لئے بلاتا ہے۔

یہ کتاب دنیاوی زندگی کے مکمل پروگرام پر مشتمل ہے اور اگر اس میں غور و خوض یا تحقیق کریں تو یہ وسیع پروگرام جس میں انسانی زندگی کے تمام اعتقادات، اخلاق و اعمال کے تمام پہلو شامل ہیں اور ان تمام صفات کے چھوٹے چھوٹے اجزاء پر بھی نظر رکھتی ہے۔ قرآن، خدا (حق) کی طرف سے ہے اور اسی کو "دینِ حق" کہتا ہے (یعنی اسلام ایسا دین ہے جس کے اصول و قوانین، حقیقت اور حقیقی صلاح سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں نہ کہ اکثریت اقوام کی خواہشات یا عوام میں سے ایک شخص کے ارادوں سے مثلاً ایک طاقتور اور حکمران انسان کی خواہشات سے)

اس وسیع پروگرام کی بنیاد بہت ہی عزیز و گرامی لفظ "حق" جس کے معنی ایک خدا پر ایمان ہے، رکھی گئی ہے اور اس کے تمام اصول و معارف، توحید (ایک خدا پر ایمان رکھنا) سے اخذ کئے گئے ہیں۔

---

[1] جیسا کہ فرماتا ہے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورہ ہود آیت ۱۳) کہتے ہیں محمدؐ نے قرآن کو جھوٹ موٹ خدا سے منسوب کر دیا ہے۔ اے نبیؐ کہدو کہ اگر جھوٹ اور تہمت ہے تو قرآن کی مانند دس سورتیں لاکر دکھاؤ اور اس کام کیلئے جس سے چاہو مدد حاصل کر سکتے ہو۔

[2] جیسا کہ فرماتا ہے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (سورہ یونس آیت ۳۸) بلکہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن جھوٹ ہے جسے خدا سے منسوب کیا گیا ہے تو کہہ دے کہ اگر یہ جھوٹ ہے تو قرآن کی طرح کی صرف ایک ہی سورت بنا کر دکھاؤ۔

[3] جیسا کہ ایک عربی شاعر کے بارے میں آیا ہے: فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (سورہ مدثر آیت ۲۴-۲۵) ترجمہ: (ولید نے بڑے غور و خوض کے بعد حق سے منہ موڑ کر سرکشی شروع کر دی) اس نے کہا، یہ قرآن سوائے جادو کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ قرآن انسانی کلام کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد پسندیدہ ترین انسانی اخلاق اصول معارف سے حاصل کرکے ان کو پروگرام کا جز بنا دیا ہے۔

پھر انسانی اعمال کے بے شمار کلی اور جزوی اصول، انفرادی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس سے متعلقہ فرائض جو ایک خدا کی پرستش اور عبادت سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں، بنائے گئے ہیں۔

دینِ اسلام میں اصول و فروع کے درمیان ایسا رابطہ موجود ہے کہ ہر قسم کے فرعی حکم کا اگر تجزیہ اور مطالعہ کیا جائے تو وہ لفظ توحید کی طرف واپس لوٹتا ہے اور لفظ توحید بھی فرعی اصول و احکام کے ساتھ مرکّب ہوتا ہے۔

البتہ ایسے وسیع آئین اور قانون کی آخری ترتیب اور ساخت کے علاوہ جو اس قدر اتحاد اور تعلّقات پر مشتمل ہے، حتیٰ کہ اس کی ابتدائی فہرست تیار کرنا بھی عام حالات میں ایک عام آدمی کی طاقت سے باہر ہے خواہ وہ دنیا کا کتنا بڑا قانون دان ہی کیوں نہ ہو تو اس شخص کی تو بات ہی دوسری ہے جو بہت کم عرصے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مصروفیات، جانی، مالی، ذاتی، عمومی مشکلات کے علاوہ خونی جنگوں، اندرونی اور بیرونی سازشوں، ممانعتوں اور رکاوٹوں میں پھنس کر آخرکار دنیا کے مقابلے میں اکیلا اور تنہا رہ گیا ہو۔

اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ نے لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا اور نہ ہی کسی سے تعلیم حاصل کی تھی اور دعوتِ اسلام سے[1] پہلے اپنی دو تہائی زندگی بھی اس قوم کے درمیان گزاری تھی جو تہذیب و تمدّن سے بالکل عاری تھی بلکہ اس قوم میں تہذیب و تمدّن کی بُو تک بھی موجود نہ تھی اور وہ قوم خشک، بنجر اور

---

[1] اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے فرماتا ہے: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (سورۃ یونس آیت ۱۶) ترجمہ: "میں قرآن مجید کے نازل ہونے سے پہلے ایک عمر تک تمہارے درمیان زندگی گزارتا رہا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے؟" اور پھر فرماتا ہے: وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ (سورۃ عنکبوت آیت ۴۸) ترجمہ: "قرآن مجید نازل ہونے سے پہلے لکھے ہوئے کو نہیں پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے لکھ سکتا تھا۔" اور پھر فرماتا ہے: وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (سورۃ بقرۃ آیت ۲۳) اور اگر تم اس قرآن کے بارے میں شک کرتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم بھی (ایسے شخص سے جو دیسی ہی شرائط رکھتا ہو یعنی جس نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو یا جس کا کوئی تعلیم دینے والا نہ ہو) محمدؐ کی طرح ایسی سورت لکھ کر لاؤ تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید خدا کا کلام نہیں ہے۔

ریگستانی زمین میں سخت گرم آب و ہوا کے اندر ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزارتی تھی اور ایسے ہی ہر روز اپنے ہمسایہ ممالک کی حکومتوں میں سے ایک کے زیرِ تسلط رہتی تھی۔

ان سب کے علاوہ قرآن مجید ایک دوسرے طریقے سے چیلنج کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کتاب بتدریج مختلف حالات و شرائط میں گوناگوں مشکلات، آسودگی، آرام، جنگ، صلح، طاقت، کمزوری وغیرہ کے دوران تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوتی رہی ہے اور اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے نہ ہوتی اور ایک انسان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوتی تو اس میں ضرور تناقض اور تضاد موجود ہوتا اور لامحالہ اس کا آخری حصہ جو پہلے حصے سے بہتر ہوتا جیسا کہ انسانی تکمیل کا لازمہ ہے، لیکن اس کتاب (قرآن) کی مکی آیات اور مدنی آیات یکساں ہیں اور اس کا آخری حصہ ابتدائی حصے سے کوئی فرق نہیں رکھتا اور یہ کتاب متشابہ الاجزاء (جس کے تمام اجزاء مشابہ اور مانند ہوں) ہے اور اپنی حیرت انگیز بیانی اور کلامی طاقت میں ایک ہی نہج اور طریقے پر ہے [1]۔

---

[1] جیسا کہ فرماتا ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (سورۃ النساء آیت ۸۲) ترجمہ: کیا یہ لوگ قرآن مجید میں تدبّر اور غور و خوض نہیں کرتے؟ اور اگر یہ قرآن خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پیدا کرتے۔

معاد کی پہچان

- انسان، روح اور بدن سے بنا ہے۔
- دوسرے نظریئے سے روح کی حقیقت کے بارے میں بحث۔
- "موت" اسلامی نظریئے کے مطابق۔
- برزخ۔
- روزِ قیامت اور دستاخیز۔
- ایک اور بیان
- پیدائش کا جاری رہنا۔

انسان، روح اور بدن سے بنا ہے

جو لوگ اسلامی علوم سے کسی حد تک واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن و سنّت میں رُوح جسم یا نفس و بدن کے بارے میں بہت زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ جسم اور بدن کا تصوّر جو ادراک کے ذریعے محسوس ہو سکتا ہے، کسی حد تک سمجھنا آسان ہے اور روح یا نفس کا تصوّر مبہم اور پیچیدہ ہے۔

شیعہ اور سنّی علمائے علم بحث، ماہرینِ علم کلام اور فلسفہ، روح کی حقیقت کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں، لیکن ایک حد تک مسلم ہے کہ اسلامی نظریئے کے مطابق روح اور بدن دو مختلف اور ایک دوسرے کے مخالف حقائق ہیں۔ موت کی وجہ سے بدن میں زندگی کی تمام خصوصیّات ختم ہو جاتی ہیں اور آخر کار یہ بدن ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ لیکن روح ایسی نہیں ہے، بلکہ حقیقی زندگی روح میں موجود ہے اور جب تک روح بدن سے متعلق ہے، بدن بھی اس سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور جب روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے اور بدن سے تعلق توڑ لیتی ہے (یعنی جب موت آ جاتی ہے)

تو بدن بے جان ہو جاتا ہے، لیکن روح اسی طرح اپنی زندگی جاری رکھتی ہے۔

جو کچھ قرآن مجید میں غور و خوض اور فکر و تدبّر سے اور ایسے ہی آئمہ اہلبیت کے بیانات سے حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی روح ایک ایسا غیر معمولی مظہر ہے جو بدن کے ساتھ ایک قسم کی ہمیشگی اور یگانگت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب قرآن مجید میں فرماتا ہے :۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً وَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط (سورۃ المومنون آیات ۱۲-۱۴)

ترجمہ: "تحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو نطفے میں تبدیل کر دیا ہے اور امن کی جگہ پر محفوظ رکھا۔ پھر نطفے کو منجمد خون کی شکل دے دی۔ اس کے بعد منجمد خون کو چبائے ہوئے گوشت کی شکل میں تبدیل کیا۔ پھر اس چبائے ہوئے گوشت کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا۔ پس ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ اس کے بعد اس کو ایک ایسی موجود بنایا جس کی اس سے پہلے مثال نہ تھی۔"

ان آیات کے معانی سے واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیات فطرت کے مادی اور تدریجی ارتقاء کو بیان کرتی ہیں اور اس کے ذیل میں جب روح یا شعور اور ارادے کی پیدائش کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں اور اس کے ذیل میں جب روح یا شعور اور ارادے کی پیدائش کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں تو ایک اور فطرت کو بیان کرتی ہیں جو پہلی قسم کی پیدائش یا فطرت کے بالکل برعکس اور مخالف ہے۔

اسی طرح قرآن مجید ایک دوسری جگہ معاد کے منکروں کے جواب میں اس مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان موت کے بعد اور بدن کے ختم ہو جانے اور زمین کے اجزاء میں گم ہو جانے کے بعد کس طرح دوبارہ زندہ ہوتا ہے اور پہلے انسان کی طرح ہو جاتا ہے ؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے پیغمبرؐ! کہہ دو کہ موت کا فرشتہ تمہیں تمہارے بدنوں سے الگ کر دیتا ہے، اور اس کے بعد تم اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جاتے ہو یعنی جو چیز موت کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے

اجزاء میں گم اور حل ہوگئی ہے وہ تمہارے بدن ہیں۔ لیکن تم کو (تمہاری روحوں کو) موت کے فرشتے نے تمہارے بدن سے نکال لیا ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہو"۔[۱] (سورۃ سجدہ آیت ۱۱)

اس قسم کی آیات کے علاوہ قرآن مجید ایک جامع بیان کے ذریعے روح کو غیر مادّی چیز کہتا ہے، اور جیسا کہ فرماتا ہے:

"اے نبیؐ! تجھ سے روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو کہدے کہ روح خدا کا امر ہے"[۲] (سورۃ اسریٰ/ بنی اسرائیل آیت ۸۵)

دوسری جگہ خدا کے امر کا یوں تعارف کراتا ہے:۔

"خدا کا امر جب کسی چیز کو بنانا چاہتا ہے تو فرماتا ہے کہ۔ ہو جا۔ اور وہ چیز بن جاتی ہے، اور ہر چیز کی حقیقت بھی یہی ہے۔"[۳] (سورۃ یٰسین آیت ۸۳)

اور ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ جہان اور اشیاء کی پیدائش میں خدا کا فرمان تدریجی نہیں ہے اور زمان و مکان کی تسخیر میں بھی نہیں آسکتا۔ پس روح جو کہ خدا کے فرمان کی حقیقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے، مادّی نہیں ہوسکتی اور اپنے وجود میں مادّیات کی خاصیّت بھی نہیں رکھتی کیونکہ مادّیات کی خاصیّت زمان و مکان کی زد میں بتدریج ارتقاء حاصل کرتی ہے۔

دوسرے نظریئے سے روح کی حقیقت کے بارے میں بحث

عقلی تحقیق اور غور و فکر بھی روح کے بارے میں قرآن کریم کے نظریئے کی تصدیق کرتے ہیں، تمام انسانوں میں سے ہر ایک اپنے بارے میں ایک حقیقت کو سمجھتا ہے اور اس سے "مَیں" کی تعبیر کرتا

۱۔ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ○

۲۔ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○

۳۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

ہے۔ انسان میں یہ ادراک ہمیشہ موجود ہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنے سر، ہاتھ، پاؤں اور تمام اعضائے بدن کو یا پورے جسم کو بھول جاتا ہے، لیکن جب تک خود موجود ہے، خود "میں" اس کے ادراک سے باہر نہیں نکلتا، اور یہ مشہود، جیسا کہ واضح ہے قابل تقسیم اور قابل تجزیہ نہیں ہے اور اگرچہ انسان کا بدن ہمیشہ تغیر و تبدل کرتا ہے اور اسی طرح مختلف مکانات اپنے لئے انتخاب کرتا رہتا ہے اور گوناگوں حالات و زمان اس پر گزرتے رہتے ہیں مگر مذکورہ بالا حقیقت یعنی "میں" اپنی جگہ پر ثابت رہتی ہے اور یہ اپنی واقعیت اور حقیقت میں ناقابلِ تغیر و تبدل ہے، لہٰذا واضح ہے کہ اگر یہ حقیقت مادی ہوتی تو جیسا کہ مادیات کی خصوصیت ہے، زمان و مکان کی تبدیلیوں اور تقسیموں کو بھی ضرور قبول کر لیتی۔

بدن ان تمام خواص کو قبول کر لیتا ہے اور روحانی تعلق اور ارتباط کی وجہ سے یہ خواص روح سے بھی منسوب کر دیئے جاتے ہیں لیکن تھوڑی سی توجہ سے انسان پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت یا اس وقت، یہاں یا وہاں، یہ مشکل یا وہ مشکل اور اس طرف یا اُس طرف، یہ تمام خواص بدن کے لئے ہیں اور روح ان خواص سے پاک اور بری ہے اور یہ تمام صفات بدن کے ذریعے اس تک بھی پہنچتی ہیں۔

اس قسم کا بیان خاص کر ادراک و شعور (علم) میں جو کہ روح کے خواص میں سے ہے، ہمیشہ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اگر علم کی خاصیت مادی ہوتی تو مادہ کے مطابق تقسیم تجزیے اور زمان و مکان کو قبول کر لیتا۔

البتہ اس عقلی بحث کا دامن بہت زیادہ وسیع ہے اور بے اندازہ سوالات کا حامل ہے (یعنی اس کے بارے میں بے انتہا سوالات کئے جا سکتے ہیں) جو اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہیں اور اس میں سما نہیں سکتے۔ اس بحث میں اسی قدر اشارے کے طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔ مکمل بحث کے لئے اسلامی فلسفے کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

موت، اسلامی نظریئے کے مطابق

اگرچہ عام طور پر لوگ، انسان کی موت کو اس کی نابودی اور بربادی تصوّر کرتے ہیں اور انسانی زندگی کو اسی چند روزہ زندگی تک محدود اور تصوّر کرتے ہیں، جو پیدا ہونے اور مر جانے

کے درمیان ہے۔ لیکن اسلام، موت کو ایک ایسا مرحلہ جانتا ہے جو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسلام کے مطابق انسان ہمیشہ کی زندگی رکھتا ہے جس کے لئے کوئی خاتمہ موجود نہیں ہے اور موت جو کہ روح اور بدن کی جدائی ہے، اس کو زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیتی ہے اور اس مرحلے میں کامیابی اور ناکامی بھی نیکیوں اور بدیوں کی بنیاد پر ہوگی جو اس مرحلے سے پہلے مرحلے میں کی گئی ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: "تمہیں یہ گمان ہے کہ تم موت سے مر جاؤ گے؟ نہیں، بلکہ تم ایک مکان یا گھر سے دوسرے مکان یا گھر میں منتقل ہو جاؤ گے۔"[1]

بَرزَخ

جیسا کہ کتاب و سنّت سے مستفاد ہوتا ہے، انسان، موت اور قیامت کے دوران ایک عام، محدود اور وقتی زندگی گزارتا ہے، جس کو "برزخ" کہتے ہیں یعنی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کا درمیانی فاصلہ ہے۔[2]

انسان سے موت کے بعد اپنے اعتقادات کی وجہ سے نیک و بد اعمال کے بارے میں جو اس نے اس دنیا میں انجام دیئے ہیں خاص طور سے پوچھ گچھ ہوگی اور ایک اجمالی حساب کے بعد جو نتیجہ حاصل ہوگا، ایک شیریں اور اچھی زندگی یا ناگوار اور تلخ زندگی اس کو عطا ہوگی اور قیامت تک اسی میں رہے گا۔[3]

برزخ میں انسان کی زندگی اس انسان کے مشابہ ہوگی جو وقتی طور پر اپنے اعمال کی وجہ سے حوالات بھیج دیا گیا ہو اور اس کا مقدمہ ابھی عدالت کے سپرد نہ ہوا ہو، اور اس سے مزید پوچھ گچھ

---

[1] بحار الانوار، جلد ۳، صفحہ ۱۶۱، اعتقاداتِ صدوقؒ۔

[2] بحار الانوار، جلد ۲، باب البرزخ۔

[3] بحار الانوار، جلد ۲، باب البرزخ۔

اور اس کے بارے میں تفتیش ابھی باقی ہو اور اس کا مقدّمہ مکمّل ہو جانے تک اس کو حوالات میں ہی رکھا گیا ہو تاکہ مقدمے کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت میں اس کے اعمال کی سزا دی جائے یا اس کو بَری کر دیا جائے۔

برزخ میں انسان کی رُوح بالکل اسی طرح ہو گی جیسے وہ دنیا میں زندگی گزارتا رہا ہو، اگر وہ نیک ہے تو اس کو نعمت، سعادت اور پاک لوگوں کی صحبت نصیب ہو گی اور اگر وہ بُرا انسان ہے تو اس کو عذاب ہو گا اور بُرے لوگوں کی صحبت نصیب ہو گی جن میں شیطان اور گمراہ لوگ شامل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ اہلِ سعادت اور خوش نصیب لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(سورۃ آل عمران آیات ۱۶۹-۱۷۱)

ترجمہ: (اے پیغمبرؐ) البتہ یہ خیال نہ کرو کہ جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے ہیں وہ مُردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اور خدا کے پاس ان کو اعلیٰ درجے نصیب ہوئے ہیں (مقرّب درگاہ ہوئے ہیں) اور ان کو خدا کی طرف سے روزی ملتی ہے اور جو چیز خدا کے فضل و کرم سے ان کو ملتی ہے وہ اس پر خوش ہیں اور مومنین میں سے جو لوگ ان کی راہ پر چلتے ہیں اور ان تک ابھی نہیں پہنچ پائے ہیں ان کو بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں (اگر یہ بھی شہید ہوں تو) ان کو بالکل خوف یا ڈر نہیں ہے، بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں کہ نعمت اور فضلِ خدا (جس کی کوئی تعریف یا حد موجود نہیں ہے) ان کے شاملِ حال ہو گی اور یقیناً خداوند تبارک و تعالیٰ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اور اسی طرح دوسرے گروہ کے بارے میں جو اپنی زندگی میں مال و دولت سے جائز فائدہ نہیں اٹھاتا یا اس کو بُرے کاموں پر صرف کرتا ہے، خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّىْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (سورۃ المؤمنون آیات ۹۹-۱۰۰)

ترجمہ:- جب ان لوگوں میں سے ایک پر موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے خدا، مجھے دوبارہ دنیا میں واپس لوٹا دے تاکہ شاید اپنے مال و دولت کو نیک راہ میں خرچ کر سکوں۔ یہ وہ کلام نہیں ہے جو وہ کہہ رہا ہے (یعنی اس کی باتوں کو نہیں سنا جائیگا) اور ایسے لوگوں کے درپیش ایک برزخ ہے جس میں وہ قیامت تک موجود رہیں گے (یعنی وہ برزخ کی حالت قیامت تک جاری رہے گی)

روز قیامت۔ رستخیز

آسمانی اور الہامی کتابوں میں قرآن مجید ہی واحد کتاب ہے جس نے قیامت کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اگرچہ توریت میں اس دن کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہوا، انجیل نے بہت ہی مختصر سا بیان قیامت کے متعلق دیا ہے۔ قرآن مجید نے سینکڑوں بار روزِ قیامت کے متعلق مختلف طریقوں اور ناموں سے اس دن کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس دن دنیا اور اہل دنیا کو کیا پیش آئے گا، بہرحال قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں کبھی اجمالی طور پر اور کبھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

بارہا بیان فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن پر ایمان بھی خدا پر ایمان لانے کے مترادف ہے اور اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک ہے لہٰذا جو شخص قیامت کا منکر ہوگا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اس کا انجام ہلاکت اور تباہی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔

حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ اگر خدا کی طرف سے حساب و کتاب اور صلہ و انعام نہ ہو تو دین کی تبلیغ اور دعوت جو خداوند تعالیٰ کے احکام کا مجموعہ ہے اور امر و نہی پر مشتمل ہے اس کا بالکل کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس طرح نبوّت و تبلیغ کا بھی کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ اس کا نہ ہونا، ہونے سے

بہتر سمجھا جائے گا، کیونکہ دین کو قبول کرکے شرعی قوانین و اصول کی پیروی، آزادی کو ہاتھ سے دینے کے برابر ہوگی اور اگر دین کی پیروی اور اطاعت کا کوئی اثر نہ ہو تو لوگ ہرگز اس کو قبول نہیں کر سکتے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے نہیں دے سکتے۔

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ روزِ قیامت پر ایمان بہت ہی اہم عنصر ہے کہ انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی طرف مائل کرکے ناپسندیدہ اخلاق اور کبیرہ گناہوں سے منع کرے جیسا کہ قیامت کو بھول جانا یا اس پر ایمان نہ رکھنا ہر گناہ اور خطا کی اصل بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پاک کتاب (قرآن مجید) میں فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ○ (سورہ ص آیت ۲۶)

ترجمہ: "جو لوگ خدا کے راستے سے ہٹ کر گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے کیونکہ انہوں نے قیامت کے دن کو بھلا دیا ہے" جیسا کہ واضح ہے، روزِ قیامت کو بھول جانا ہر گمراہی اور گناہ کی اصل بنیاد ہے۔

انسان اور کائنات کی پیدائش میں غور کرنے اور ایسے ہی آسمانی شریعتوں (احکام و اصول) کی غرض و غایت سے ایک ایسے دن (قیامت) کے موجود ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔

جب ہم ان حوادث و واقعات پر غور و خوض کرتے ہیں جو کائنات میں رونما ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام بھی (کہ ہر کام ایک قسم کی ضرورت اور حرکت پر مشتمل ہے) بغیر کسی غرض و غایت کے انجام نہیں پاتا اور ہرگز اپنے آپ اور مقصود و مطلوب کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ غرض و غایت پر مشتمل ہے اور اسی اصلی مقصد کا مقدّمہ ہے اور اسی مقصود کی خاطر انجام پاتا ہے حتیٰ کہ وہ کام اور امور جو ظاہری طور پر بے مقصد شمار ہوتے ہیں مثلاً قدرتی کام یا بچوں کے کھیل وغیرہ۔ اگر ان میں بھی غور کریں تو ان کاموں کے مناسب غرض و غایت کا مشاہدہ کرینگے جیسا کہ قدرتی امور جو عام طور پر حرکت پر مشتمل ہیں، وہ مقصد جس کی طرف حرکت کرتے ہیں وہی ان

کی غرض و غایت ہے اور بچوں کے کھیلوں میں بھی کھیلوں کے مناسب ایک خیالی اور وہمی مقصد موجود ہے جو اس کھیل کی اصلی بنیاد ہے (یعنی اس خیال اور گمان تک پہنچنا)

البتہ کائنات اور جہان کی پیدائش خدا کا کام ہے اور خداوند تعالیٰ بیہودہ اور بے مقصد کام انجام دینے سے پاک ہے۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ پیدا کرتا ہے، روزی دیتا ہے، مارتا ہے اور پھر دوبارہ زندہ کرتا ہے، روزی دیتا ہے، مارتا ہے اور اسی طرح بناتا ہے اور پھر ختم کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کائنات سے اس کو کوئی فائدہ پہنچے یا ایک مستقل مقصد کو نظر میں رکھے۔

پس ناچار دنیا اور انسان کی خلقت اور پیدائش کا ایک مستقل مقصد ہے۔ البتہ اس کا فائدہ یا منافع خدا کو نہیں پہنچتا کیونکہ خداوند تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور ہر فائدہ صرف مخلوق کو ہی پہنچتا ہے۔ پس یوں کہنا چاہئے کہ یہ دنیا اور انسان ایک مستقل چیز اور مکمل وجود کی طرف چل رہے ہیں جس میں زوال اور فنا موجود نہیں ہے۔

اور جب دینی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی ہم انسانوں کے بارے میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رہنمائی اور دینی تعلیم کے اثر سے لوگ دو گروہوں یعنی نیکو کاروں اور بدکاروں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس طرح اس زندگی میں کوئی فرق و امتیاز موجود نہیں ہے بلکہ بالکل برخلاف اور اکثر ترقی و کامیابی بدکاروں اور ظالموں کو ہی ملتی ہے اور نیکو کار لوگ ہمیشہ مصائب و مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور اس دنیا میں ان کے لئے ہر قسم کی محرومیت اور مصیبت موجود ہوتی ہے۔

اس صورت میں عدل خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسری دنیا پیدا کرے اور وجود میں جس میں دونوں گروہ اپنے عمل کی سزا اور جزا کو پہنچیں اور ہر گروہ اپنے اپنے حال کے مطابق زندگی گزارے۔ خداوند تعالیٰ ان دونوں طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الدخان آیات ۳۸-۳۹)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے، بیہودہ اور

بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے اور یہ احتمال ان لوگوں کی عقل و خرد اور خیال سے بہت دور ہے جو خدا کے منکر ہو گئے ہیں۔ ان کافروں کے حال پر افسوس کہ ان کو آگ (دوزخ) کا وعدہ کیا گیا آیا جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں ان کے ساتھ ان لوگوں کی طرح سلوک کیا جائے گا جو زمین میں تباہی اور بربادی لاتے ہیں؟ یا پرہیزگاروں کو بھی فاسقوں اور برے لوگوں کی طرح رکھا جائے گا؟

اور دوسری جگہ دونوں طریقوں اور دلیلوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الجاثیہ آیات ۲۱-۲۲)

ترجمہ: کیا جو لوگ جرم اور قتل و غارت گری کرتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی طرح رکھیں گے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں؟ جن کی موت اور زندگی برابر ہے، تو ان لوگوں کا گمان غلط ہے۔ خدا نے آسمانوں اور زمینوں کو حق پیدا کیا ہے (نہ کہ بے ہودہ) اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مقابلے میں سزا یا جزا ملے گی بغیر اس کے کہ کسی پر ذرا برابر بھی ظلم ہو (یعنی کسی کا ذرا بھر حق ضائع کیا جائے)

ایک اور بیان

قرآن مجید کے ظاہر و باطن کے متعلق ہم نے اس کتاب کے دوسرے باب میں اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم میں اسلامی علوم و معارف کے بارے میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے جو مجموعی طور پر ظاہر و باطن کے دو طریقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔

ظاہری طریقے کا بیان وہ بیان ہے جو عام فہم اور سادہ لوگوں کے لئے مناسب ہے اور

باطنی طریقے کے بالکل برعکس جو خاص لوگوں سے متعلق ہے اور یا معنوی اور روحانی ذریعے سے سمجھا جاتا ہے۔

وہ معانی جو ظاہری طریقے سے حاصل ہوتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کو اس کائنات کا مطلق حکمران اور فرمان روا بیان کرتے ہیں کہ تمام جہان اور کائنات اسی کی ملکیت ہے۔ خدا تعالیٰ نے بے شمار فرشتوں کو پیدا کیا ہے جو اس کے فرمان بردار اور اس کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ اور اس کائنات کے چپے چپے میں پھیلاتے ہیں۔ کائنات کا ہر حصہ اور نظام فرشتوں کے ایک خاص گروہ سے متعلق ہے جو اس حصے یا نظام کی نگرانی کرتے ہیں۔

انسان بھی خدا کے بندے اور اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور وہ مجبور ہیں کہ خدا کے حکم کی اطاعت کریں اور پیغمبرِ خدا کے ان بیانات اور قوانین کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں کے لئے بھیجے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کا نفاذ چاہتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اطاعت کے لئے سزا اور جزا کا وعدہ فرمایا ہے اور کفر و گناہ کے لئے عذاب و سزا کا وعدہ کیا ہے۔ اور جیسا کہ فرماتا ہے، وہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ عادل ہے اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری دنیا اور پیدائش میں نیکو کاروں اور بدکاروں کے دو گروہ ایک جیسی زندگی سے بہرہ مند نہیں ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو آپس میں علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا ہے یعنی اچھے لوگوں کو اچھی زندگی اور برے لوگوں کو بری زندگی ملے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل کے مطابق جو وعدہ فرمایا ہے، اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو کسی استثناء کے بغیر موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور ان کے ایمان و اعتقادات اور اعمال کے بارے میں مکمل تفتیش کرے گا اور ان کے درمیان حقیقت اور حق پر مبنی فیصلے اور عدل کرے گا اور اس کے نتیجے میں ہر حقدار کو اس کا حق مل کر رہے گا اور ہر مظلوم کی فریاد سن کر ظالم سے اس کا حق لے گا اور ہر عمل کی پاداش ہر انسان کو ملے گی۔ انسانوں میں سے ایک جماعت دائمی بہشت میں اور دوسری جماعت دائمی دوزخ میں جائے گی۔

یہ قرآن کریم کا ظاہری بیان ہے اور البتہ بالکل ٹھیک اور درست ہے لیکن ایسی چیز ہے جو انسان کے اجتماعی فکر کی پیداوار ہے۔ یہ اسی لئے تالیف اور مرتب کی گئی ہے تاکہ اس کا فائدہ عمومی تر اور اس کے عمل کا دائرہ وسیع تر ہو جائے۔

جو لوگ حقائق کے دائرے میں قدم رکھتے ہیں اور قرآن مجید کی باطنی اور معنوی زبان سے ایک حد تک آشنا ہیں، ان بیانات سے ایسے مطالب اور حقائق کو سمجھتے ہیں جو عام فہم اور عام سطح فکر سے بہت ہی بالاتر ہیں۔ قرآن کریم بھی اپنے روان اور سلیس بیانات کے اندر کبھی کبھی ایسے بیانات، مضامین وحقائق اور باطنی مقاصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

قرآن کریم اپنے گوناگوں اشاروں کے ساتھ اجمالی طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ کائنات اپنے تمام اجزاء کے ساتھ کہ خود بھی انہی اجزاء میں سے ایک ہے، اپنی ارتقائی حرکت میں (جو ہمیشہ کمال کی طرف جاری ہے) خدا کی طرف حرکت کر رہی ہے اور ایک دن ایسا آئیگا کہ اپنی اس حرکت کو ختم کر کے خداوند تعالیٰ کی عظمت و شوکت کے سامنے اپنے وجود کو بالکل کھو دے گی (یعنی اس کا وجود مٹ جائے گا)

انسان بھی اسی کائنات اور جہان کا ایک حصہ ہے اور اس کا خاص ارتقاء علم و شعور کے ذریعے سے ہے اور بڑی تیزی سے خدا کی طرف حرکت کر رہا ہے اور جس دن اس کی یہ حرکت آخری حد تک پہنچ جائے گی تو خدا کی وحدانیت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کیونکہ ہر کمال کی صفت اور قدرت صرف خدائے واحد کی مقدس ذات کے ہاتھ میں ہے اور اسی حقیقت کے ذریعے سے ہر چیز اپنی اصلی حالت میں اس کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

یہ ابدی جہان کی پہلی منزل ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اس دنیا میں اپنے نیک اعمال اور ایمان کے ذریعے خدا کے ساتھ رابطہ، تعلق، الفت، محبت اور ایسے ہی خدا کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کے ساتھ تعلق رکھے تو اس کو بھی خداوند تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کے پاس عالم بالا میں ایک خوش نصیب، سعادت مندانہ زندگی نصیب ہوگی جو ناقابل تعریف ہے اور اگر اس فانی دنیا کی لذتوں کے ساتھ اپنی زندگی میں محبت کرے گا تو اس عالم بالا سے اپنا رشتہ اور تعلق توڑ کر

خداوند تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندوں سے رشتۂ محبت نہیں رکھے گا بلکہ ایک دردناک عذاب اور ایک ابدی بدبختی میں گرفتار ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ اس زندگی میں انسان کے نیک و بد اعمال وقتی اور عارضی ہیں اور جلد ہی ختم ہو جانے والے ہیں لیکن یہ نیک و بد اعمال انسان کے باطن میں قائم رہتے ہیں اور جہاں کہیں وہ جائے اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور یہی اعمال انسان کی آئندہ اچھی یا بُری، شیریں یا تلخ زندگی کی بنیاد اور اس کا سرمایہ ہیں۔

گزشتہ مطالب کے لئے مندرجہ ذیل آیات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ○ (سورۃ العلق آیت ۸)

ترجمہ: یقینی واپسی تیرے رب کی طرف ہے۔

اور پھر فرماتا ہے: اَلَآ اِلَی اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ○ (سورۃ الشوریٰ آیت ۵۳)

ترجمہ: خبردار تمام امور خدا کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے: وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ○ (سورۃ انفطار آیت ۱۹)

ترجمہ: آج کے دن تمام امور خدا کے لئے ہیں۔

پھر فرماتا ہے: يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ○ (سورۃ الفجر آیات ۲۷ تا ۲۹)

ترجمہ: اے نفس جس نے آرام اور سکون حاصل کیا ہے (خدا کی یاد سے) اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جا، جبکہ تو راضی ہے اور خدا بھی تجھ سے راضی ہو گیا ہے۔ پس ہمارے بندوں کی صف میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں داخل ہو جا۔

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا خطاب یوں ہوگا، جیسے فرماتا ہے:۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ

فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○ (سورۃ ق آیت ۲۲)

ترجمہ: جن چیزوں کو آج تو دیکھ رہا ہے ان سے تو غافل رہا ہے۔ اب تیری آنکھوں سے ہم نے پردے اٹھا دیئے ہیں اور اس کے نتیجے میں آج تیری آنکھیں تیز بین ہو گئی ہیں۔

قرآن کریم تاویل کے بارے میں جن حقائق سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے ان کے بارے میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ (سورۃ الاعراف آیت ۵۳)

ترجمہ: "کیا یہ لوگ قرآن مجید کو نہیں مانتے کہ تاویل کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر ہیں؟ جس دن اس کی تاویل واضح ہو جائے گی اس وقت جو لوگ اس (قرآن) کو بھولے ہوئے ہیں وہ کہیں گے کہ ہمارے خدا کے پیغمبر حق پر تھے۔ پس کیا ہمارے لئے بھی کوئی شفاعت کرنے والا موجود ہے، جو ہماری شفاعت کرے؟ یا یہ کہ ہم دنیا میں واپس لوٹا دیئے جائیں اور ان اعمال کے برعکس انجام دیں جو ہم پہلے انجام دیتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نفس (ذات) کو نقصان پہنچایا ہے، اور جو تہمت لگاتے تھے اس کو بھول گئے ہیں۔"

اور پھر فرماتا ہے: يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ○ (سورۃ النور آیت ۲۵)

ترجمہ: "اس دن خداوند تعالیٰ ان کی حقیقی جزا اور پاداش دے گا اور وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک آشکارا اور بے پردہ حقیقت ہے اور بس۔"

پھر فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ○ (سورۃ الانشقاق آیت ۶)

ترجمہ: " اے انسان جو کہ بڑی مشکل اور مصیبت کے ساتھ اپنے خدا کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے، پس تو اس سے ضرور ملاقات کرے گا۔"

پھر فرماتا ہے: مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ (عنکبوت آیت ۵)

ترجمہ: " جو شخص خدا سے ملاقات کا شائق اور امیدوار ہو (جان لے) کہ جو وقت خدا تعالیٰ نے ملاقات کے لئے مقرر کر رکھا ہے وہ وقت ضرور آئے گا۔"

پھر فرماتا ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (سورۃ الکہف آیت ۱۱۰)

ترجمہ: "پس جو شخص اپنے خدا سے ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہئے کہ نیک اعمال انجام دے اور خدا کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائے۔"

اور پھر فرماتا ہے: يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝

(سورۃ الفجر آیات ۲۷ تا ۳۰)

ترجمہ: اے نفس جس نے آرام اور سکون حاصل کیا ہے (خدا کی یاد سے) اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جا جبکہ تو راضی ہے اور خدا بھی تجھ سے راضی ہو گیا ہے، پس ہمارے بندوں کی صف میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

پھر فرماتا ہے: فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ؕ ۝ (سورۃ النازعات آیات ۳۴ تا ۴۱)

ترجمہ: جس وقت سب سے بڑا حادثہ یا واقعہ (روزِ قیامت) رونما ہو گا۔ جس دن انسان اپنی تمام کوششوں کو یاد کرے گا اور جس دن وہ آگ جو عذاب کے لئے جلائی گئی ہے، سامنے آئے گی (تو لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے) لیکن جس شخص نے سرکشی اور نافرمانی کی ہے اور

اس نے دنیا کو اپنے لئے انتخاب کیا ہے، مذکورہ آگ اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ اور جو شخص خدا کی نافرمانی سے ڈرا ہے اور اپنے نفس (اپنے آپ) کو دنیاوی خواہشات (ناپسندیدہ اور برے اعمال) سے بچائے رکھا ہے، اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہوگا۔"

اور پھر اعمال کی سزا کے بارے میں فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (سورۃ التحریم آیت ۷)

ترجمہ: "اے لوگو جو کافر ہو گئے ہو، عذر اور بہانے نہ لاؤ، آج (روز قیامت) جو سزا تمہیں دی جائے گی اس کی وجہ وہی تمہارے اعمال ہیں جن کو تم نے انجام دیا ہے۔"

پیدائش کا جاری رہنا

یہ جہان جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، بیکران اور بے اندازہ عمر نہیں رکھتا (غیر فانی نہیں ہے) اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ جہان اور اہلِ جہان ختم ہو جائیں گے، جیسا کہ قرآن مجید بھی اس مطلب کی تصدیق کرتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ (سورۃ الاحقاف آیت ۳)

ترجمہ: "ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سوائے حق اور معین وقت کیلئے پیدا نہیں کیا ہے۔"

اور وہ محدود و معین وقت جس کا نام لیا گیا ہے، کیا اس موجودہ جہان اور انسان کی پیدائش سے پہلے کوئی اور دنیا یا انسان پیدا کیا گیا تھا؟ کیا اس دنیا کا کھیل ختم ہو جائے گا؟ اور اس کے بعد جس کی قرآن بھی خبر دیتا ہے کوئی اور دنیا پیدا ہوگی اور انسان پیدا کیا جائے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا براہ راست جواب قرآن کریم میں نہیں مل سکتا، صرف اشارے موجود ہیں، لیکن وہ احادیث و روایات جو آئمہ اہلبیتؑ سے نقل ہوئی ہیں ان سوالات کا مثبت جواب دیتی ہیں۔ (بحار الانوار جلد ۱۴۔ صفحہ ۷۹)

امام شناسی

- امام کے معنی۔
- امامت اور اسلامی حکومت میں پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی۔
- گزشتہ کلام کی تائید و تصدیق میں۔
- معارف الٰہی کے بیان میں امامت کا مفہوم۔
- امام اور نبی کے درمیان فرق۔
- باطنی اعمال میں امامت کا مفہوم۔
- آئمہ اور اسلامی رہبر۔
- بارہ اماموںؑ کی زندگی پر اجمالی نظر۔
- حضرت امام مہدی عجؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (عام عقیدے کے مطابق)
- حضرت امام مہدی عجؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (خاص عقیدے کے مطابق)

امام کے معنی

امام، پیشوا یا رہبر اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک جماعت یا گروہ کی رہنمائی اور راہبری کا بیڑا اپنے کندھوں پر اٹھائے اور عوام کو ایک اجتماعی طریقے، سیاسی نظریئے یا علمی و دینی مسلک پر چلانے کے لئے رہنمائی کرے۔ البتہ اپنی آئیڈیالوجی کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے ہر حالت میں اسی نظریئے یا آئیڈیالوجی کے تابع ہوگا۔

دینِ مقدس اسلام (جیسا کہ گزشتہ ابواب سے واضح ہوگیا ہے) ہر لحاظ سے تمام انسانوں کی زندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے احکام صادر کرتا ہے۔

لہٰذا اسلام ہر چیز کا معنوی زندگی کے لحاظ سے مطالعہ کرتے ہوئے راہنمائی کرتا ہے اور اسی طرح ظاہری زندگی میں بھی انفرادی زندگی اور اس کے انتظام کے طور پر مداخلت کرتا ہے۔ جیسا کہ اجتماعی زندگی اور حکومت کے لحاظ سے مداخلت کرتا ہے۔

ان پہلوؤں کی بناء پر جن کو یہاں پر گنا گیا ہے، اسلام میں امامت اور دینی پیشوائی تین طریقوں پر قابل توجہ ہو سکتی ہے :

۱۔ اسلامی حکومت کے لحاظ سے۔

۲۔ اسلامی معارف واحکام کو بیان کرنے پر۔ اور

۳۔ معنوی زندگی کی قیادت اور رہنمائی کے لئے۔

شیعہ مذہب کا اعتقاد ہے، جیسا کہ اسلامی معاشرہ تین طریقوں کے لئے نیاز مند اور محتاج ہے، جو شخص مذکورہ پہلوؤں کو کنٹرول کرنے کا ذمہ دار یا عہدیدار ہے اور ایک گروہ یا جماعت کی امامت اور پیشوائی کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے، وہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے متعیّن ہونا چاہئے۔ اور البتّہ اگر پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے مقرّر اور معیّن کیا گیا ہو تو وہ بھی خدا ہی کے حکم سے ہے۔

امامت اور اسلامی حکومت میں پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انسان اپنی خداداد فطرت اور سرشت کے ذریعے قوتِ ادراک یا فہم وشعور رکھتا ہے کہ ایک معاشرہ مثلاً ایک ملک، شہر، گاؤں، قبیلہ اور حتیٰ کہ ایک گھرانہ یا گھر جو چند افراد پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، ایک سرپرست یا حکمران کے بغیر اپنی زندگی اور بقاء کو قائم اور جاری نہیں رکھ سکتا، جو تمام معاشرے کو چلاتا ہے اور کنٹرول کرتا ہے اور تمام کام اسی کے ارادے یا ذریعے سے انجام پاتے ہیں اور وہی شخص معاشرے کے تمام افراد کو ان کی اجتماعی ذمہ داریوں کے لئے ابھارتا ہے، اور اگر اس معاشرے میں ایسا شخص موجود نہ ہو تو بہت ہی تھوڑے عرصے میں معاشرے کے اہم اجزاء درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے اور اس کی عمومی حالت ہرج ومرج سے دوچار

ہو جائے گی۔

اسی وجہ سے جو شخص معاشرے کا فرمان روا یا حکمران ہے (خواہ چھوٹا معاشرہ ہو یا بڑا) اور اپنی طرف یا معاشرے کی بقاء کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اگر چاہے کہ وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لئے اپنے کام سے بے توجہ رہے تو اپنا ایک جانشین یا نائب مقرر کرتا ہے اور ہرگز اپنی حکومت یا فرمانروائی کو ویسے ہی بے سرپرست کے نہیں چھوڑ دیتا اور اس معاشرے کے زوال یا بقاء سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

ایک خاندان کا سرپرست جو چند دن یا چند مہینے کے سفر پر جانا چاہتا ہے اور اپنے گھر اور گھر والوں کو الوداع کہتا ہے تو اہل خاندان میں سے ایک شخص (یا کسی دوسرے) کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے اور گھر کے تمام کاروبار اسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک دفتر کا سرپرست، انچارج، ڈائرکٹر یا ایک دکان کا مالک جہاں پر چند کاریگر، مزدور یا کارکن کام کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی چند گھنٹے کی غیر حاضری کے لئے بھی ان میں سے کسی ایک کو اپنی جگہ پر معیّن کر دیتا ہے تاکہ بوقت ضرورت دوسرے لوگ اس کی طرف رجوع کریں اور یہی قانون ہر جگہ موجود ہے۔

اسلام ایسا دین ہے جو کتاب و سنّت کے مطابق فطرت پر قائم ہے، اور ایک ایسا اجتماعی قانون ہے کہ ہر آشنا اور غیر آشنا اس حقیقت کو اس میں مشاہدہ کرتا ہے اور خدائے تعالیٰ اور پیغمبر اکرمؐ نے اس دین کی طرف جو توجہ مبذول فرمائی ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا یا اس کا کسی دوسری چیز کے ساتھ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

وہ اجتماعی مسائل جو اسلام سے متعلق ہوتے تھے اور جن میں اسلام کی مداخلت ضروری ہوتی تھی، پیغمبر اکرمؐ ان کو ویسے ہی نہیں چھوڑ دیتے تھے اور اسی طرح ہر وہ شہر یا گاؤں جو مسلمانوں کے قبضے میں آتا تھا، اکثر اوقات وہاں اپنا والی یا حاکم مقرّر کر دیتے تھے اور مسلمانوں کے تمام امور کو اس کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، حتیٰ کہ وہ فوجیں جو جہاد کے لئے بھیجی جاتی تھیں ان میں کبھی کبھی ایک سے زیادہ جرنیلوں کو یکے بعد دیگرے مقرّر کر دیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ جنگِ موتہ میں ایک ہی فوج میں چار جرنیلوں کو مقرر کیا گیا، تاکہ اگر پہلا جرنیل شہید ہو جائے تو دوسرا اس

کی جگہ لے، اور اگر دوسرا شہید ہو جائے تو تیسرا کمان سنبھال لے اور اگر تیسرا بھی شہادت پا جائے تو چوتھا اس کی جگہ فوجی کمان اور امور کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اور سب فوجیں اسکی اطاعت کریں۔

اسی طرح آپؐ جانشینی کے مسئلے پر بھی بہت زیادہ توجہ دیا کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی اپنا جانشین مقرر کر دیا کرتے تھے اور نائب یا حاکم معین کرنے میں کبھی سستی نہیں کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جب بھی مدینہ سے کہیں دوسری جگہ سفر پر جاتے تو اپنی جگہ پر ایک والی یا حکمران مقرر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب آپؐ مکّہ سے مدینہ ہجرت کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی کوچ نہیں فرمایا تھا تو اس وقت بھی مکّہ میں اپنے ذاتی کاموں کو انجام دینے یا لوگوں کی امانتیں واپس لوٹانے کے لئے علیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور اسی طرح اپنی وفات کے بعد ذاتی کاروبار یا لین دین کے لئے بھی علیؑ کو اپنا نائب یا جانشین بنایا تھا۔

شیعہ کہتے ہیں کہ اسی دلیل کی بناء پر یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پیغمبر اکرمؐ رحلت فرمائیں اور کسی کو اپنا جانشین قرار نہ دیں اور مسلمانوں کے امور کی سرپرستی اور اسلامی معاشرے کے کاروبار کو چلانے کے لئے کچھ نہ کریں۔

یہ مسئلہ کہ ایک معاشرے کی پیدائش ایک مشترکہ رسوم و قوانین اور اصول پر مشتمل ہوتی ہے جن کو اس معاشرے کے اکثر افراد اور اجزاء عملی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور اس معاشرے کی بقاء اور اس کا دوام ایک عادلانہ حکومت پر مبنی ہے جو ان قوانین و اصول کو عملی طور پر اس معاشرے میں نافذ کرتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی اہمیّت میں انسانی فطرت کو کوئی شک و شبہ نہیں ہے یا یہ بھی نہیں ہے کہ کسی عقلمند انسان کے لئے پوشیدہ ہو یا اس کو بھلایا جا سکے۔ اسی طرح اسلامی شریعت کی وسعت اور گہرائی میں بھی کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس اہمیّت اور قدر و قیمت میں جو پیغمبر اکرمؐ اس شریعت کے لئے قائل تھے اور اس راہ میں فداکاری اور جدوجہد فرمایا کرتے تھے، کسی شک و تردید کی گنجائش ہے۔ اور نہ ہی پیغمبر اکرمؐ کے فکر و کمال، عقل اور حسن تدبیر (وحی و نبوّت کی تائید و تصدیق کے علاوہ) کوئی جھگڑا ہو سکتا ہے۔

اخبارِ متواتر کے مطابق جو عام و خاص سے نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں اور کتبِ احادیث میں موجود ہیں، پیغمبر اکرمؐ نے ان مشکلات اور فتنوں کے بارے میں جو آپؐ کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرے میں رونما ہوئے اور وہ بدعنوانیاں جو اسلام میں رسوخ کر گئیں مثلاً آلِ مروان کی حکومت وغیرہ جنہوں نے آئینِ مقدّس کو ناپاکیوں، بدعنوانیوں اور آلودگیوں پر فدا کر دیا تھا، تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ جب آپؐ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بعد رونما ہونے والے حوادث، واقعات اور مشکلات کے بارے میں غفلت نہیں کرتے تھے اور ان کو واضح طور پر بیان فرماتے تھے تو وہ اہم حالات و واقعات جو آپؐ کی رحلت کے فوراً بعد رونما ہوئے ان سے غفلت یا اغماض کرتے اور ایسے سادہ مگر اہم کام کو، سچ سمجھیں اور جب کہ آپؐ بہت ہی عام اور قدرتی امور یعنی کھانے، پینے، سونے اور ایسے ہی دوسرے سینکڑوں کاموں کے بارے میں احکام تو صادر فرمائیں لیکن ایسے اہم مسئلہ کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کرتے ہوئے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کریں؟

اگر بفرضِ محال اسلامی شریعت میں اسلامی معاشرے کے لئے کسی حکمران کا تعیّن خود عوام پر چھوڑ دیا گیا تھا تب بھی ضروری تھا کہ پیغمبر اکرمؐ اس خاص مسئلے میں بیانات اور کافی احکام صادر فرماتے تاکہ اس مسئلے کے متعلق جو بنیادی طور پر اسلامی معاشرے کی رشد و بقاء سے وابستہ ہے اور دین کے تمام احکام و شعائر اس پر ہی منحصر ہیں، عوام ہوشیار اور بیدار ہو جاتے۔

حالانکہ پیغمبر اکرمؐ کے ایسے بیانات اور دینی احکام کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے اور اگر ہوتی تو جن لوگوں نے پیغمبر خداؐ کی رحلت کے بعد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے، جبکہ خلیفۂ اوّل نے خلافت کو اپنی وصیّت کے ساتھ خلیفہ دوّم کے سپرد کیا اور اسی طرح خلیفہ چہارم نے خلافت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ اور خلیفہ دوم نے چھ رکنی کمیٹی کے ذریعے کہ خود بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے اور اس کمیٹی کا منشور بھی خود انہوں نے ہی مرتّب کیا تھا، خلافت کو خلیفہ سوم کے ہاتھ منتقل کر دیا تھا۔ معاویہ نے امام حسنؑ کو زبردستی صلح پر

آمادہ کرلیا اور اس طرح خلافت پر قبضہ کرلیا۔ پھر اس کے بعد خلافت موروثی سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور آہستہ آہستہ دینی شعائر و احکام مثلاً جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حدود (شرعی سزائیں) وغیرہ یکے بعد دیگرے اسلامی معاشرے سے مٹتے گئے اور اسلام کے مبلغوں کی تمام کوششیں نقش برآب ہوگئیں۔ [1]

انسان کے قدرتی ادراک، دانشوروں اور عقلمندوں کی ہمیشہ قائم رہنے والی سیرتوں اور دینِ اسلام کے بنیادی نظریئے میں بحث و تحقیق جو خود فطرت کے مقاصد کو دوبارہ زندہ کرتے ہیں، اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کا معاشرتی طریقہ، ان افسوس ناک حوادث کا مطالعہ جو آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد رونما ہوئے اور وہ مشکلات جو مسلمانوں کے سامنے آئیں، پہلی صدی ہجری میں اسلامی حکومتوں کی سہل انگاری، کوتاہی اور سستی کی وجہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے بہت زیادہ احادیث متواتر مثلاً آیۂ ولایت اور حدیثِ غدیر، حدیثِ سفینہ، حدیث ثقلین، حدیثِ حق، حدیثِ منزلت، حدیث دعوتِ ذوالعشیرۂ اقربین وغیرہ [2] یہ سب احادیث اس مطلب کا ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن بعض حدیثوں کی تاویل کرکے ان کے اصلی معانی کو نگاہوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

---

[1] امامت اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی اور اسلامی حکومت کے بارے میں مطالب کی تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل اسناد کی طرف رجوع کریں:۔ تاریخ یعقوبی جلد۲ صفحہ ۲۶ تا ۶۱۔ سیرت ابن ہشام جلد۲ صفحہ ۲۲۳ تا ۲۷۱۔ تاریخ ابی الفداء جلد اوّل صفحہ ۱۲۶، غایت المرام صفحہ ۶۶۴، مسند احمد وغیرہ۔

[2] آیۂ ولایت:۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی خلافت کے اثبات میں قرآن مجید کی آیات سے استدلال ہوا ہے اور ان میں سے ایک یہ آیۂ کریمہ ہے:۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ○ (سورۃ المائدہ آیت ۵۵)

ترجمہ: تمہارے ولی امر اور صاحب اختیار صرف خدا، رسول اور وہ مومن لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور رکوع کی حالت میں صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

گزشتہ کلام کی تائید و تصدیق میں

پیغمبر اکرمؐ کی بیماری و علالت کے آخری دنوں میں کچھ اصحاب آپ کے پاس موجود تھے۔

شیعہ اور سنّی مفسّرین کا اتفاق ہے کہ مندرجہ بالا آیتِ کریمہ حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس ضمن میں خاص و عام ذرائع سے بہت زیادہ احادیث نقل ہوئی ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں :۔

"ایک دن ظہر کی نماز میں نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ادا کی۔ ایک سائل نے لوگوں سے مدد کی درخواست کی، لیکن کسی نے بھی اسے کوئی چیز نہیں دی۔ سائل نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا : اے خدا ! گواہ رہنا کہ پیغمبر اکرمؐ کی مسجد میں سے کسی نے مجھے کوئی چیز نہیں دی۔ حضرت علیؑ اس وقت رکوع کی حالت میں تھے۔ آپؑ نے انگلی سے سائل کو اشارہ کیا۔ سائل نے آپؑ کے ہاتھ سے انگوٹھی اتار لی اور چلا گیا۔ پیغمبر اکرمؐ اس واقعے کو دیکھ رہے تھے، انہوں نے اپنا سر مبارک آسمان کی طرف بلند کیا اور عرض کی :

اے خدا ! میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے درخواست کی تھی کہ (اے خدا) میرے سینے کو کھول دے اور میرے کاموں کو آسان کر دے اور مجھے ناطق زبان عطا فرما، تاکہ لوگ میری باتوں کو سنیں اور سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر اور مددگار بنا دے۔ پس اس وقت وحی نازل ہوئی کہ ہم تیری طاقت اور تیرے ہاتھوں کو تیرے بھائی ہارون کے ذریعے مضبوط کریں گے اور تجھے نفوذ اور تسلّط عطا کریں گے۔ اے خدا ! میں بھی تیرا پیغمبر ہوں، میرے سینے کو کھول دے اور میرے کاموں کو آسان کر دے۔ اور علیؑ کو میرا وزیر اور مددگار بنا دے !

حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ ابھی پیغمبر اکرمؐ کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

(ذخائر العقبیٰ تالیف طبری طبع قاہرہ ۱۳۵۶ھ صفحہ ۱۶ - یہی حدیث تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ در المنثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۳ میں بھی نقل ہوئی ہے)

بحرانی نے کتاب غایت المرام صفحہ ۱۰۳ میں ۲۴ حدیثیں عام ذرائع سے اور ۱۹ حدیثیں خاص ذرائع سے اس آیۂ کریمہ کی شانِ نزول میں لکھی ہیں۔

اور دوسری آیات میں ایک آیت یہ ہے :

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۃ مائدہ آیت ۳)

ترجمہ: آج کے دن کفار، اسلامی معاشرے اور حکومت کے ختم ہونے سے مایوس اور نا امید ہو گئے ہیں، (باقی اگلے صفحے پر)

اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا :

"میرے لئے کاغذ، قلم اور دوات لاؤ تاکہ تمہارے لئے ایک چیز لکھتا جاؤں تاکہ میرے

پس اب ان سے مت ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو، ہم نے آج تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمتیں مکمل کر دی ہیں اور تمہارے لئے دین اسلام کو انتخاب کیا ہے۔

اس آیۂ کریمہ کے ظاہری معنی یوں ہیں کہ اس آیۂ کریمہ کے نزول سے پہلے کافروں کو یہ امید تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ اسلامی حکومت ختم ہو جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک کام کو انجام دینے کے ذریعے ان کافروں کو ہمیشہ کے لئے اسلام کی تباہی سے مایوس کر دیا ہے اور وہی کام دین کی بنیاد اور تکمیل و استحکام کا باعث ہوا ہے۔ یہ کام یقینی طور پر سطحی اور عام مسائل میں سے نہیں تھا اور نہ ہی اس کو جعلی یا بنا دٹی کہا جا سکتا ہے، بلکہ بہت ہی قابل توجہ اور اہم موضوع تھا جس سے اسلام کی بقاء اور زندگی مربوط ہے۔

ظاہری طور پر یہ آیۂ کریمہ اسی سورہ کے آخر میں نازل ہونے والی آیۂ کریمہ سے بے ربط نہیں ہے :-

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ (سورۃ المائدہ آیت ۶۷)

ترجمہ: اے نبیؐ! جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے اور ان کو سنا دے۔ اور اگر تم نے نہ سنایا تو تم نے خدا کی رسالت کو انجام ہی نہیں دیا اور خدائے تعالیٰ تجھے ہر خطرے سے اپنی پناہ اور امان میں محفوظ رکھے گا۔

یہ آیۂ کریمہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت ہی قابلِ توجہ اور اہم موضوع کے بارے میں اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا ہے کہ اگر وہ کام انجام پذیر نہ ہو تو گویا اسلام کی بنیاد اور رسالت خطرے میں پڑ جائے گی، لیکن پیغمبر اکرمؐ اس موضوع کو بیان کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتے تھے اور اس اہم کام کے لئے مناسب موقع کے منتظر تھے کیونکہ عوام کی طرف سے ممانعت، رکاوٹ اور خطرے سے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے فوری اور تاکید کے ساتھ حکم ملا کہ اس کام کو انجام دینے میں تأمل نہ کریں اور فوراً انجام دیں اور نہ ہی کسی سے ڈریں۔ یہ موضوع یقینی طور پر دوسرے احکام کی طرح نہیں تھا کیونکہ ایک یا چند قوانین کی تبلیغ کی یہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کی تبلیغ نہ کرنے سے اسلام کی بنیاد اکھڑ جائے گی اور نہ ہی پیغمبر اسلامؐ قوانین کے بیان کرنے اور تبلیغ سے خوفزدہ تھے۔

یہ قرائن اور شواہد، اخبار و احادیث کی تصدیق کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات غدیر خم کے مقام پر حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی جانشینی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بہت زیادہ شیعہ اور سنی مفسرین نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

(باقی اگلے صفحے پر)

بعد اس کی پیروی کرنے سے کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔"

ابوسعید خدری فرماتے ہیں: "پیغمبر اکرمؐ نے غدیر خم کے مقام پر لوگوں کو علی کی طرف دعوت دی۔ آپؐ نے حضرت علیؑ کے بازو کو پکڑ کر اس قدر بلند کیا کہ پیغمبر اکرمؐ کی بغل کی سفیدی دکھائی دینے لگی۔ اسکے بعد آیہ کریمہ نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً (مائدہ آیت ۳)

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "اللہ اکبر، دین کی تکمیل، نعمتوں کی تکمیل، خدا کی رضا مندی اور خوشنودی اور میرے بعد حضرت علیؑ کی ولایت۔" پھر فرمایا: "جس کا میں مولا اور صاحبِ اختیار ہوں، علیؑ بھی اس کا مولا اور صاحبِ اختیار ہے۔ اے خدا! علیؑ کے دوست کو دوست جان اور اس کے دشمن کو دشمن سمجھ، جو شخص اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور جو شخص اس کا ساتھ چھوڑ دے۔ تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے۔"

بحرانی نے کتاب غایۃ المرام کے صفحہ ۳۳۶ پر ۶ احادیث عام ذرائع سے اور ۱۵ احادیث خاص ذرائع سے اس آیہ کریمہ کی شانِ نزول میں نقل کی ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلام کے دشمن، اسلام کی نابودی اور تباہی کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، اگرچہ وہ ہر لحاظ سے مایوس اور نا امید ہو چکے تھے مگر ایک طرف سے امیدوار تھے اور خیال کرتے تھے کہ جب اسلام کا محافظ اور نگہبان اس دنیا سے چلا جائے گا اور اسلام کسی قیمؑ اور سرپرست کے بغیر رہ جائے گا تو اس کی نابودی اور تباہی یقینی ہو جائے گی لیکن غدیر خم میں ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو اسلام کے سرپرست اور محافظ کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور علیؑ کے بعد بھی یہ بھاری کام اور فرض پیغمبرؐ کے خاندان جو علیؑ کی اولاد سے ہونگے ان کے ذمے لگایا۔ (زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر المیزان تالیف علامہ محمد حسین طباطبائی جلد ۵ صفحہ ۱۷۰، ۲۱۴ اور جلد ۶ صفحہ ۵۰ اور ۶۴ کی طرف رجوع کریں)

حدیثِ غدیر: پیغمبر اکرمؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر پڑاؤ کیا اور مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔ پھر حضرت علیؑ کو ولایت، پیشوائی اور امامت پر فائز کیا۔

براء کہتے ہیں کہ وہ حجۃ الوداع میں رسولِ خداؐ کی خدمت میں تھے۔ جب غدیر خم کے مقام پر پہنچے، تو آپؐ کے حکم سے ایک جگہ کو صاف کیا گیا۔ پھر آپؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی دائیں طرف کھڑا کیا اور فرمایا: "کیا میں تمہارا صاحبِ اختیار یا مولا نہیں ہوں؟" لوگوں نے جواب دیا: "کیوں نہیں، ہمارا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "جس شخص کا میں مولا اور صاحبِ اختیار ہوں، علیؑ بھی اس کے مولا اور صاحبِ اختیار ہوں گے۔ خدایا، علیؑ کے دوست کے ساتھ دوستی اور اس کے دشمن کے ساتھ دشمنی کر۔"

(باقی اگلے صفحے پر)

بعض حاضرین نے کہا :

اس کے بعد عمر بن خطاب نے حضرت علیؑ سے کہا، "یہ عہدہ آپ کے لئے مبارک ہو کہ آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے مولا بن گئے ہیں۔" (البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۰۸ اور جلد ۷ صفحہ ۳۴۶۔ ذخائر العقبہ تالیف طبری طبع قاہرہ صفحہ ۶۷، ۱۳۵۶ھ۔ فصول المہمہ تالیف ابن صباغ جلد ۲ صفحہ ۲۳)

خصائص، تالیف نسائی طبع نجف ۱۳۶۹ھ ص ۳۱۔ بحرانی نے کتاب غایۃ المرام صفحہ ۷۹ پر اس حدیث کی مانند ۸۹ حدیثیں عام ذرائع سے اور ۴۳ حدیثیں خاص ذرائع سے نقل کی ہیں۔

حدیث سفینہ :۔ ابن عباس کہتے ہیں، پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : "میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتیِ نوحؑ کی طرح ہے کہ جو شخص اس میں سوار ہو گیا وہ غرق ہونے سے بچ گیا اور جس نے خلاف ورزی کی وہ غرق ہو گیا۔"

(ذخائر العقبیٰ صفحہ ۲۰۔ صواعق محرقہ تالیف ابن حجر کی طبع قاہرہ صفحہ ۱۵۰ و ۸۴۔ تاریخ الخلفاء تالیف جلال الدین سیوطی صفحہ ۳۰۷۔ نور الابصار تالیف شبلنجی طبع مصر صفحہ ۱۱۴۔ بحرانی نے غایۃ المرام صفحہ ۲۳۷ پر مذکورہ حدیث کو گیارہ عام طریقوں اور سات خاص ذرائع سے نقل کیا ہے)

حدیث ثقلین :۔ زید بن ارقم نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :۔

"گویا خدا نے مجھے اپنی طرف واپس بلا لیا ہے اور میں نے قبول کر لیا ہے۔ لیکن دو بڑی (گرانقدر) چیزیں تمہارے درمیان چھوڑ کر جا رہا ہوں، یعنی خدا کی کتاب (قرآن مجید) اور اپنے اہلبیتؑ۔ تم پر فرض ہے کہ ان کی محافظت کرو۔ تم ان سے کیسا سلوک کرو گے؟ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی، یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے ساتھ مل جائیں گی۔"

(البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۰۹۔ ذخائر العقبیٰ صفحہ ۱۶۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۲۔ خصائص صفحہ ۳۰۔ صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۷۔ غایۃ المرام میں ۳۹ عام ذرائع سے اور ۸۲ خاص ذرائع سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے)

حدیثِ ثقلین جو مسلّم اور قطعی ہے اور مختلف عبارات میں مکمل طور پر نقل ہوئی ہے۔ سنّی اور شیعہ دونوں فرقے اس کی صحت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ اس حدیث اور دوسری حدیثوں میں چند اہم مطالب نظر آتے ہیں :۔

۱۔ قرآن مجید قیامت تک لوگوں میں باقی رہے گا۔ اسی طرح عترتِ پیغمبرؐ بھی قیامت تک باقی رہے گی۔ یعنی کوئی زمانہ بھی امام اور رہبرِ حقیقی سے خالی نہ رہے گا۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان دونوں چیزوں کے ذریعے مسلمانوں کی علمی اور دینی ضروریات کو پورا کر دیا ہے۔ اور اپنے اہلبیتؑ کو علم و دانش کے مرجع کے طور پر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے اور ان کے اقوال و اعمال کو (باقی اگلے صفحے پر)

"پیغمبر اکرمؐ بیماری اور بخار کی حالت میں (نعوذ باللہ) ہذیان کہہ رہے ہیں اور ہمارے

معتبر شمار کیا ہے۔

۳ ــ قرآن اور اہلبیتؑ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرنا چاہئے۔ اور کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اہلبیتؑ کے علوم سے چشم پوشی کرے اور اپنے آپ کو ان کے حلقۂ ارشاد و ہدایت سے باہر لے جائے۔

۴ ــ اگر عوام اہلبیتؑ کی اطاعت کریں اور ان کے اقوال و کلام کی پیروی کریں تو ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے اور ہمیشہ حق پر قائم رہیں گے۔

۵ ــ تمام ضروری علوم اور لوگوں کی دینی ضروریات اہلبیتؑ کے پاس موجود ہیں اور جو شخص بھی ان کی پیروی کرے گا وہ ضلالت و گمراہی میں گرفتار نہیں ہوگا اور حقیقی سعادت تک پہنچ جائے گا۔

یعنی اہلبیتؑ خطا اور گناہوں سے پاک ہیں۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عترتؑ اور اہلبیتؑ سے مراد پیغمبر اکرمؐ کی تمام اولاد اور خاندان نہیں ہے بلکہ معینہ افراد ہیں جو علومِ دین میں مکمل دسترس رکھتے ہیں اور وہی گناہ و خطا کے دائرے سے باہر ہیں اور ان میں رہبری اور راہنمائی کی صلاحیت و استعداد موجود ہے اور وہ ہیں حضرت علی ابن ابیطالبؑ اور آپؑ کے گیارہ فرزند جو یکے بعد دیگرے امامت پر منصوب ہوئے ہیں۔ جیسا کہ احادیث سے بھی یہی مراد ہے۔ مثال اور نمونے کے طور پر ابن عباس کہتے ہیں:

"میں نے پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا کہ آپؐ کے خاندان کے افراد جن سے محبت کی جائے، کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ۔" (ینابیع المودت صفحہ ۳۱۱)

جابر کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:۔

"خدائے تعالیٰ کے ہر پیغمبر کی اولاد کو اس کے صلب میں رکھا گیا ہے، لیکن میری اولاد علیؑ کے صلب میں رکھی گئی ہے۔" (ینابیع المودت صفحہ ۳۱۸)

حدیث حق :۔ ام سلمہ فرماتی ہیں، میں نے رسول خداؐ سے سنا، وہ فرماتے تھے:

"علیؑ، قرآن اور حق کے ساتھ ہیں اور قرآن و حق، علیؑ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ آپس میں جدا نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ کوثر پر میرے ساتھ مل جائیں۔"

(غایۃ المرام صفحہ ۵۳۹ میں یہی مضمون ۱۴ عام ذرائع سے اور دس خاص ذرائع سے نقل ہوا ہے)

حدیث منزلہ :۔ سعد بن وقاص کہتے ہیں، رسول خداؐ نے علیؑ سے فرمایا:۔

"(اے علیؑ) کیا تو خوش نہیں ہے کہ تیری اور میری نسبت ایسی ہے جیسی موسیٰؑ اور (باقی اگلے صفحے پر)

لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔" اس وقت حاضرین میں کچھ شور سا اٹھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:
"اٹھو اور میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کے سامنے شور وغل نہیں کرنا چاہئے۔"[1]

ہارون کی تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔"

(البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۳۳۹۔ ذخائر العقبیٰ صفحہ ۶۳۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۱۔ کفایۃ الطالب تالیف گنجی شافعی صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۴۔ خصائص صفحہ ۱۹ تا ۲۵۔ صواعق محرقہ صفحہ ۱۷۷۔ غایۃ المرام صفحہ ۱۰۹۔ ایک سو احادیث عام ذرائع سے اور ۷۰ احادیث خاص ذرائع سے نقل کی گئی ہیں)

حدیث دعوت عشیرہ :- پیغمبر اکرمؐ نے اپنے خاندان والوں کو کھانے کی دعوت دی۔ غذا تناول کرنے کے بعد فرمایا: "مجھے ایسے شخص کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے جو مجھ سے بہتر چیز اپنی قوم کے لئے لایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی دعوت دوں۔ پس کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے اور تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور خلیفہ بنے۔" تمام لوگوں نے خاموشی اختیار کی، لیکن علیؑ جو سب سے چھوٹے تھے، اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے کہا: "میں آپؐ کا وزیر اور مددگار ہوں گا۔" پس پیغمبر اکرمؐ نے اپنا بازو ان کی گردن میں ڈال دیا اور فرمایا: "یہ میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہے۔ تمہیں چاہئے کہ اس کی اطاعت کرو۔" اس کے بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے اور مذاق کے طور پر ابوطالب سے کہتے تھے کہ محمدؐ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔ (تاریخ ابی الفداء جلد اول صفحہ ۱۱۶)

اور اس قسم کی احادیث بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک میں حذیفہ کہتے ہیں، رسول خداؐ نے فرمایا:
"اگر علیؑ کو میرا جانشین اور خلیفہ بناؤ، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ نہیں بناؤ گے، تو اس کو بابصیرت اور عقلمند رہنما پاؤ گے جو تمہیں سچے اور حقیقی راستے کی طرف رہنمائی کرے گا۔"

(حلیۃ الاولیاء تالیف ابونعیم جلد اول صفحہ ۶۴۔ کفایۃ الطالب، طبع نجف ۱۳۵۶ھ صفحہ ۶۷)

ابن مردویہ کہتے ہیں، پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی زندگی اور موت میری طرح ہو اور اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہو، وہ میرے بعد علیؑ سے محبت کرے اور میرے اہلبیتؑ کی پیروی کرے کیونکہ وہ میری عترت ہیں اور میری مٹی (وجود) سے پیدا ہوئے ہیں (میری اولاد ہیں) اور میرا علم و دانش اور فہم و شعور ان کو ملا ہے۔ پس جو شخص ان کے علم و فضل کی تردید کرے میں ہرگز اس کی شفاعت نہیں کروں گا۔" (منتخب کنز العمال جو مسند احمد کے حاشیئے کے ساتھ چھپی ہے، جلد ۵۔ صفحہ ۹۴)

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۲۲۷۔ شرح ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۱۳۳۔ الکامل فی التاریخ جلد ۲ صفحہ ۲۱۷۔ تاریخ الرسل والملوک تالیف طبری، جلد ۲، صفحہ ۳۱۶۔

گزشتہ باب کے مطالب پر توجّہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کے اس فیصلے کے عملی ہونے میں رکاوٹ اور ممانعت کی تھی۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس واقعے کے بعد دوسرے دن ہی انتخابی خلافت سے فائدہ اٹھایا اور خاص کر خلیفہ کا انتخاب حضرت علیؑ اور ان کے خاندان کی اطلاع کے بغیر ہی انجام دیا تھا اور ان کو کام ختم ہو چکنے کے بعد اطلاع ملی تھی۔ کیا اس میں کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کے جانشین کے طور پر حضرت علیؑ کو پیش کرنا مقصود تھا ؟

اس کلام سے اصل مقصد شور و غل کرنا تھا تاکہ پیغمبر اکرمؐ اس وجہ سے اپنے فیصلے اور ارادے سے ہٹ جائیں، نہ کہ (اس نادرست کلام کا مطلب بیماری کا غلبہ تھا) اس کے حقیقی معنی مفقود ہوں، کیونکہ :

اوّل : پیغمبر اکرمؐ کی تمام مدّتِ بیماری میں ایک لفظ بھی نابجا آپؐ سے نہیں سنا گیا تھا اور نہ کسی نے بھی اسے لکھا، دینی لحاظ سے ایک مسلمان، پیغمبر اکرمؐ سے جو معصوم اور ہر گناہ سے پاک تھے، ہذیان اور بیہودہ گوئی کو منسوب نہیں کر سکتا۔

دوسرے : اگر اس کلام کے حقیقی معنی مفقود تھے تو دوسرے فقرے کا موقع محل (کہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے) نہیں تھا بلکہ پیغمبر اکرمؐ کے کلام کا نابجا ہونا آپؐ کی بیماری سے استدلال ہوتا نہ کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کے کلام کی ضرورت نہیں، کیونکہ ایک صحابی کے لئے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس خدا کی کتاب نے پیغمبر اکرمؐ کو واجب الطاعت اور آپؐ کے کلام کو خدا کا کلام کہا ہے اور قرآن کریم کی آیات کے مطابق لوگ، خدا اور رسولِ خداؐ کے حکم کے مقابلے میں کسی قسم کی آزادی یا اختیارِ عمل نہیں رکھتے۔

تیسرے : یہی واقعہ خلیفۂ اوّل کے مرض الموت میں بھی تکرار ہوا اور انہوں نے خلیفہ دوم کی خلافت کے بارے میں وصیّت کی۔ حضرت عثمان جب خلیفہ کے حکم سے وصیّت نامہ لکھ رہے تھے تو خلیفہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے باوجود خلیفہ دوم نے ہرگز وہ بات نہیں کی تھی

جو پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں کہی تھی اور وہ بات خلیفۂ اوّل کے بارے میں تکرار نہیں ہوئی تھی۔[1]

ان کے علاوہ خلیفہ دوم، ابن عباس کی حدیث میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

"میں جانتا ہوں کہ پیغمبر اکرمؐ، علیؑ کی خلافت کا حکم دینا چاہتے ہیں لیکن میں نے مصلحت کی بناء پر اس رائے میں خلل ڈال دیا"۔

پھر کہتے ہیں: "خلافت علیؑ کا حق تھا لیکن اگر علیؑ خلیفہ بن جاتے تو لوگوں کو حقیقت اور سچائی کے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرتے اور قریش ہرگز اس بات کو نہ مانتے، اس لئے ہم نے علیؑ کو خلافت سے ہٹا دیا ہے"۔

دینی احکام کے مطابق خلاف ورزی کرنے والوں کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ حق پر چلیں، نہ کہ خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے حق کو پامال کر دیا جائے۔ جب خلیفۂ اوّل کو خبر ملی کہ مسلمان قبیلوں کی ایک بڑی جماعت نے زکوٰۃ دینے سے منہ موڑ لیا ہے تو انہوں نے حکم دیا کہ ان کے خلاف جہاد کیا جائے اور کہا کہ اگر عوام ہر وہ چیز یا کوڑی جو زکوٰۃ کے طور پر رسول اکرمؐ کو دیا کرتے تھے، مجھے نہ دیں گے تو میں ان کے ساتھ جنگ کروں گا[2] البتہ اس کلام سے مراد یہ تھی کہ ہر قیمت پر حق کو زندہ کرنا چاہئے اور حقیقی خلافت کا موضوع ایک کوڑی سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ تھا۔

معارفِ الٰہی کے بیان میں امامت کا مفہوم

پیغمبر شناسی کے متعلق بحث میں گزر چکا ہے کہ "عمومی ہدایت" کے مستقل اور لازمی قوانین کے مطابق ہر قسم کی مخلوق اور کائنات اپنی فطری پیدائش اور تکوینی آفرینش کے ذریعے کمال و سعادت کی طرف گامزن ہے اور اسی طرف اس کی رہنمائی اور ہدایت ہوتی ہے۔

انسان بھی جو کائنات کی ایک قسم ہے اس عمومی قانون کے دائرے سے باہر یا مستثنیٰ نہیں ہے، لہٰذا حقیقت بینی اور اجتماعی تفکّر کے ذریعے اپنی زندگی میں خاص طریقے پر ہدایت حاصل

---

[1] و [2] البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۳۱۱۔

کرتا ہے جو اس کی دنیوی اور اخروی سعادت کو پورا کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کو چاہئے کہ خاص عقائد اور عملی فرائض کو سمجھ کر اپنی زندگی کے طریقے کو ان کے ساتھ مطابقت دے تاکہ اپنی سعادت اور انسانی کمال و مرتبے کو حاصل کر سکے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ زندگی کے اس پروگرام اور منصوبے کو سمجھنے کا طریقہ جس کو "دین" کہا جاتا ہے، عقل کے ذریعے ممکن اور میسّر نہیں ہے بلکہ ایک اور طریقے سے میسّر ہے جس کو وحی اور نبوت کہتے ہیں اور وہ بھی دنیا میں بعض پاک فطرت انسانوں کو ملتی ہے، جن کو پیغمبر یا نبی کہا جاتا ہے۔

یہ پیغمبر ہی ہیں جو انسانی فرائض کو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے حاصل کر کے ان کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں تاکہ ان پر عمل کرنے سے لوگوں کو سعادت اور خوش نصیبی حاصل ہو۔

واضح ہے کہ یہ دلیل و برہان، جیسا کہ ادراک کی ضرورت کو افراد میں ثابت کرتی ہے، اسی طرح ان افراد کی پیدائش کی ضرورت کو بھی ثابت کرتی ہے جو اس پروگرام کی حفاظت کر سکیں اور حتی الامکان اس کو لوگوں تک پہنچائیں۔

جیسا کہ خدائی توجہ کے لئے ضروری ہے کہ ایسے اشخاص پیدا ہوں جو انسانی فرائض کو وحی کے ذریعے سمجھ اور حاصل کر کے ان کو عوام تک پہنچائیں اور ان فرائض کی تعلیم لوگوں کو دیں، اسی طرح ضروری ہے کہ یہ خدائی اور انسانی فرائض ہمیشہ کے لئے اس دنیا میں محفوظ رہیں اور اگر ضرورت پڑے تو لوگوں کو ان کی تعلیم دی جائے یعنی ہمیشہ ایسے اشخاص موجود ہوں جن کے پاس خدا کا دین موجود اور محفوظ رہے اور موقع کے مطابق ان پر عمل کیا جائے۔

جو شخص آسمانی دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس عہدے اور منصب پر فائز اور منصوب ہوا ہے اسے "امام" کہا جاتا ہے جیسا کہ جو شخص وحی و نبوت کا عہدیدار ہے اور آسمانی دین و احکام کو خدا کی طرف سے حاصل کرتا ہے اسے "نبی" کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبوت و امامت ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں اور ممکن ہے ایک دوسرے سے جدا ہوں، جیسا کہ مذکورہ دلیل پیغمبروں کی عصمت و طہارت اور امانتداری کو ثابت کرتی ہے۔ اسی

طرح اماموں اور پیشواؤں کی عصمت و طہارت کو بھی ثابت کرتی ہے، کیونکہ ہمیشہ کے لئے حقیقی دین کسی کمی بیشی کے بغیر اور قابلِ تبلیغ انسانوں میں موجود رہنا چاہئے اور یہ کام خدائی عصمت و طہارت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

نبی اور امام میں فرق

گزشتہ دلیل جو آسمانی شریعتوں اور احکام کو وصول کرنے کے بارے میں آئی ہے کہ پیغمبران احکام کو خدا کی طرف سے حاصل کرتے ہیں، یہی دلیل اصل وحی یعنی آسمانی احکام وصول کرنے کو ثابت کرتی ہے نہ کہ اس کے ہمیشہ جاری رہنے کو، اور یہ مسئلہ وحی کی حفاظت کے بالکل برعکس ہے جو ہمیشگی اور دائمی امر ہے (یعنی وحی کو خدا کی طرف سے وصول کرنا اور اس کو بندوں تک پہنچانا ایک الگ مسئلہ ہے اور وحی کی ہمیشہ حفاظت دوسرا مسئلہ ہے) لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ انسانوں کے درمیان ایک پیغمبر ہمیشہ کے لئے موجود رہے۔ لیکن امام کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے جو آسمانی دین کا محافظ اور نگہبان ہے اور یہ انسانی معاشرہ امام کی ضرورت سے ہرگز خالی نہیں ہو سکتا۔ خواہ یہ معاشرہ اسے (امام کو) پہچانتے یا نہ پہچانتے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے :

فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِهَا هٰۤؤُلَاۤءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِهَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِهَا بِکٰفِرِیۡنَ (انعام آیہ ۸۹)

ترجمہ : اور اگر ہماری ہدایت کے ذریعے بھی کافر ایمان نہیں لاتے جس میں ہرگز خلاف ورزی اور تبدیلی نہیں ہے تو ہم نے ایک گروہ کو ان کا نگران بنا دیا ہے جو ان (کافروں) کے ذریعے ہرگز کافر نہیں ہو گا۔

اور جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ کبھی کبھی نبوت اور امامت (دونوں منصب) یکجا جمع ہو جاتے ہیں اور ایک ہی شخص دونوں عہدوں کا حامل ہو جاتا ہے یعنی پیغمبر بھی ہوتا ہے اور امام بھی۔ (آسمانی شریعت اور احکام کو وصول کرتا ہے اور ان کی نگہبانی اور حفاظت کا عہدیدار بھی ہوتا ہے) اور کبھی کبھی یہ دونوں منصب جدا جدا اور الگ الگ ہوتے ہیں، جیسا کہ ممکن ہے ایک زمانے میں پیغمبر نہ ہو لیکن ہر زمانے میں حقیقی امام موجود ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے پیغمبروں کی تعداد محدود ہے

اور ہمیشہ پیغمبر نہیں آسکتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب (قرآن مجید) میں بعض پیغمبروں کا امامت کے ساتھ تعارف کراتا ہے جیساکہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرماتا ہے :

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ○ (سورۃ البقرہ آیت ۱۲۴)

ترجمہ: "جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا مختلف طریقوں سے امتحان لیا تو پھر ان امتحانوں کو ختم کر دیا اور فرمایا، میں نے تجھے عوام اور بنی نوع انسان کے لئے امام اور رہبر بنا دیا ہے۔ ابراہیمؑ نے عرض کی کہ کیا میری اولاد سے بھی (کسی کو امام بنایا گیا ہے) ؟ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا وعدہ اور پیمان ظالموں اور ستمگاروں کے ساتھ ہرگز نہیں ہوتا۔"

اور پھر فرماتا ہے : وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورہ انبیاء آیت ۷۳)

ترجمہ: اور ہم نے ان کو امام اور رہبر بنا دیا ہے جو ہمارے حکم سے ہدایت اور رہبری کرتے تھے۔

باطنی اعمال میں امامت کا مفہوم

جس طرح لوگوں کے ظاہری اعمال کے لئے امام، پیشوا یا دینی رہبر کی ضرورت ہے اسی طرح باطن میں بھی امام رہبری اور ہدایت کرتا ہے اور وہی انسانی قافلے کا سالار ہے جو باطن کے ذریعے خدا کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔

اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے مندرجہ ذیل دو مقدموں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے :

اوّل : اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اسلام کی نظر میں اور تمام آسمانی ادیان کی نظر میں بھی انسان کی ہمیشگی سعادت و شقاوت (خوش بختی اور بدبختی) کا واحد وسیلہ اس کے نیک اور بُرے اعمال ہیں جس کی آسمانی دین بھی تعلیم دیتا ہے اور انسان اپنی خداداد فطرت اور سرشت کے ساتھ ان کو سمجھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی اور نبوّت کے ذریعے ان اعمال کو ہمارے طرزِ تفکّر کے مناسب بڑی سادہ اور معاشرتی زبان میں امر و نہی، حسن و قبیح کی صورت میں بیان فرمایا ہے اور ان کی اطاعت یا نافرمانی کے مقابلے میں نیکوکاروں اور فرمان برداروں کو ہمیشہ خوشحال زندگی کی خوشخبری دی ہے وہ زندگی جس میں ہر قسم کی انسانی لذّتیں موجود ہیں اور بدکار و ستمگار لوگوں کو ہمیشہ تلخ اور بدبختی سے بھرپور زندگی کا وعدہ دیا ہے جس میں ناکامی اور حسرت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

اس میں بھی شک نہیں ہے کہ کائنات کا خدا ہر چیز سے بالاتر ہے اور ہمارے تصوّر اور وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ ہماری طرح معاشرتی تفکّر بھی نہیں رکھتا اور یہ تنظیم ایک خدائی و بندگی، فرمان روائی اور فرمان برداری، امر و نہی، مزد و پاداش کا معاہدہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کے باہر اس کا وجود نہیں ہے اور یہ خدائی تنظیم کائنات کی وہی تنظیم ہے جس میں زندگی اور ہر چیز کی پیدائش خدا کی فطرت سے حقیقی تعلق اور رابطہ رکھتی ہے اور بس۔

جیسا کہ قرآن کریم[1] اور پیغمبر اکرمؐ کی احادیث میں اشارہ ہوا ہے، دین ایسے حقائق و معارف پر مشتمل ہے جو عام اور معمولی فہم سے بہت زیادہ بالاتر ہے، مگر خداوند تعالیٰ نے اس کو ایسے الفاظ میں بیان فرمایا ہے جو ہماری سطحِ فکر کے مناسب ہے اور ہمارے لئے قابلِ فہم ہے۔

اس بیان سے یہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیئے کہ نیک و بد اعمال اور ابدی زندگی کی خصوصیّات میں ایک حقیقی تعلق اور رابطہ موجود ہے کیونکہ مستقبل کی خوشی اور رنج خدا کی مرضی پر اور ان لوگوں کے اعمال پر مشتمل ہے۔

سادہ الفاظ میں ہر نیک و بد عمل کے ذریعے انسان میں ایک حقیقت پیدا ہو جاتی ہے

---

[1] نمونے کے طور پر: وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ (سورہ زخرف آیت ۲ تا ۴) ترجمہ: قسم ہے اس واضح اور روشن کتاب (قرآن مجید) کی، ہم نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اس لئے نازل فرمایا ہے کہ شاید تم اس میں غور و خوض کرو اور یہ قرآن ہمارے پاس لوح محفوظ (اُمّ الکتاب) میں بہت ہی بلند مرتبہ اور عزیز و حکیم ہے۔

کہ اس کی آئندہ زندگی اسی حقیقت کی مرہونِ منّت ہے۔

انسان سمجھے یا نہ سمجھے بالکل ایک بچے کی طرح جو زیرِ تربیّت ہو اور اپنے معلّم سے اسے جو حکم ملتا ہے یعنی "یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو" سنتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا مگر بڑا ہونے اور زمانۂ تربیّت گزارنے کے بعد اپنی روحانی صلاحیّتوں کے ذریعے جو اس نے اپنے باطن میں پیدا کرلی ہوتی ہیں، معاشرے میں سعادتمندانہ زندگی حاصل کرلیتا ہے اور اگر وہ اپنے خیر خواہ معلّم کا حکم ماننے سے انکار کرے تو بدنصیبی اور بدبختی کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

یا اس شخص کی طرح جو ڈاکٹر کی نصیحت کے مطابق دوا، خوراک اور مخصوص ورزش کو ہمیشہ انجام دیتا ہے اور ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرنے یا اس پر عمل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی کسی دوسرے کام سے سروکار رکھتا ہے، تو اس نسخے پر عمل کرنے سے اس کا بدنی ڈھانچہ اور اندرونی حالت ایسے ہوجاتے ہیں جو تندرستی، صحت اور ہر قسم کی خوشی کی ضمانت دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انسان اس ظاہری زندگی کے اندر ایک دوسری باطنی زندگی (معنوی زندگی) رکھتا ہے جو اس کے اعمال پر مبنی ہے اور رشد و نمو کرتی ہے اور دوسری دنیا میں انسان کی خوش نصیبی یا بدنصیبی انہی اعمال سے متعلق ہے۔

قرآن مجید بھی اس عقلی بیان کی تصدیق کرتا ہے اور بہت زیادہ آیات[1] میں نیکوکاروں اور اہل ایمان کے لئے ایک دوسری زندگی اور دوسری روح کو جو موجودہ زندگی اور رُوح سے بہت

---

[1] ان آیات کی طرح وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ○ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (سورہ ق آیت ۲۱، ۲۲) یعنی قیامت کے دن تمام لوگ اپنے اپنے گواہوں اور ماموروں کے ساتھ دوبارہ اٹھیں گے (اور ان سے کہا جائیگا کہ) تم اس زندگی سے غافل اور بے اطلاع تھے، پس ہم نے آج تمہاری آنکھوں سے پردۂ غفلت اٹھا دیا ہے اور اب تمہاری آنکھیں تیز بین ہوگئی ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (سورۃ النحل آیت ۹۷)
جو شخص بھی نیک کام کرتا ہے اور مومن ہے ہم اسے زندہ کردیتے ہیں اور پاکیزہ اور اچھی زندگی اسے عطا ہوتی ہے۔ اور (باقی اگلے صفحے پر)

ہی بالاتر ہے ثابت کرتا ہے اور باطنی اعمال کے نتیجے کو بھی ہمیشہ انسان کے ساتھ ساتھ جانتا ہے۔ احادیثِ نبوی میں بھی اسی مطلب کی طرف بہت زیادہ اشارے ہوئے ہیں۔[1]

اَسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (سورۃ انفال آیت ۲۴) جب خدا اور رسول تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دیں جس سے تم زندہ ہو جاؤ تو فوراً اس کو قبول کرلو۔

یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ (سورہ آل عمران آیت ۳۰) یعنی (قیامت) وہ دن ہے جس دن ہر شخص اپنے اچھے یا برے کام کو اپنے سامنے دیکھ لے گا جو اس نے دنیا میں انجام دیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ ۗ وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (سورہ یٰسین ۱۲) ہم مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور انکے اعمال و آثار کو لکھتے ہیں اور ہم نے تمام چیزوں کو امام مبین کے اختیار میں دے رکھا ہے۔

[1] نمونے کے طور پر اللہ تعالیٰ پیغمبرؐ کے واقعہ معراج کے سلسلے میں فرماتا ہے: فمن عمل برضائی الزمہ ثلاث اعرفہ شکراً لا یخالطہ الجھل وذکراً لا یخالطہ النسیان ومحبّۃ لا یوثر علی محبتی محبّۃ المخلوقین. فاذا احبّنی احببتہ وافتح عین قلبہ الی جلالی ولا اخفی علیہ خاصۃ خلقی واناجیہ فی ظلم اللّیل ونور النھار حتی ینقطع حدیثہ مع المخلوقین ومجالستہ معھم واسمعہ کلامی وکلام ملائکتی واعرّفہ السرّ الذی سترتہ عن خلقی والبسہ الحیا حتّی یستحی منہ الخلق ویمشی علی الارض مغفوراً لہ واجعل قلبہ واعیًا وبصیراً ولا اخفی علیہ شیئًا من جنّۃ ولا نارٍ واعرّفہ ما یمرّ علی الناس فی القیامۃ من الھول الشدّۃ۔ (بحار الانوار، طبع کمپانی، جلد ۱۷، صفحہ ۹) ترجمہ: پس جو شخص میری مرضی کے لئے کام کرے وہ تین خصلتیں رکھتا ہے کہ میری طرف سے اس کو دی گئی ہیں:۔ (۱) وہ شکر جس میں جہالت نہیں ہوتی (۲) وہ محبت جس میں کسی چیز کو خدا پر ترجیح نہ دی جائے۔ (۳) وہ ذکر جس میں فراموشی نہ ہو۔ ایسا شخص جب مجھ سے پیار کرتا ہے تو میں بھی اس سے پیار کرتا ہوں اور اس کے دل اور آنکھوں کو اپنے نور سے روشن کر دیتا ہوں اور اپنے خاص بندوں کو ان کی آنکھوں سے پنہاں نہیں کرتا۔ پھر رات کی تاریکی اور دن کے نور میں اس سے باتیں کرتا ہوں یہاں تک کہ لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے اور میں اپنی اور فرشتوں کی باتوں کو اسے سناتا ہوں اور اس کو اس راز سے واقف کرتا ہوں جو دوسروں پر آشکار نہیں کیا گیا اور اسے شرم و حیا کا لباس پہناتا ہوں وہ زمین پر چلتا ہے لیکن وہ پاک ہوتا ہے۔ اس کے دل کو ہوشیار اور آگاہ کر دیتا ہوں۔ بہشت اور دوزخ کی کسی چیز کو اس سے پوشیدہ نہیں رکھتا اور قیامت کی مصیبت کو جو لوگوں پر ہو گی، اس سے واقف کر دیتا ہوں۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال استقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ حارثۃ بن مالکؓ بن

دوّم : یہ کہ عام طور پر یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ ممکن ہے ہم میں سے ایک شخص کسی دوسرے کو اچھے یا بُرے کام کی طرف رہنمائی کرے حالانکہ خود اپنے قول پر پابند نہ ہو، مگر پیغمبروں اور اماموں میں ہرگز یہ چیز موجود نہیں ہوتی کیونکہ ان کی قیادت، رہنمائی اور ہدایت خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ انسانوں کو جس دین کی طرف ہدایت اور رہنمائی کرتے ہیں اور جس ہدایت کے ذمہ دار ہوتے ہیں خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور معنوی زندگی کی طرف لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں،

کیونکہ اگر خدا خود کسی شخص کو ہدایت نہ کرے تو دوسروں کی ہدایت اور راہنمائی اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا اور خدا کی خاص ہدایت میں ہرگز کبھی کوئی خطا یا غلطی نہیں ہوتی۔

اس بیان سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں :۔

۱۔ ہر اُمّت کے امام اور پیغمبر مکمل معنوی اور دینی زندگی میں سب سے پہلے درجے پر ہوتے ہیں جس کی طرف وہ دوسروں کو ہدایت اور دعوت دیتے ہیں کیونکہ وہ مکمل طور پر اپنے دعوے اور دعوت پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی طرح معنوی زندگی کی شرائط پر بھی پورا اترتے ہیں۔

النعمان الانصاری۔ فقال لہٗ : کیف انت یا حارثۃ بن مالک ؟ فقال : یا رسول اللہ مومنٌ حقّاً۔ فقال لہ رسول اللہ۔ لِکلّ شیءٍ حقیقۃٌ فما حقیقۃ قولک ؟ فقال یا رسول اللہ عزّفت نفسی عن الدنیا فاسھرت لیلی واظمات ھواجیری فکانّی انظر الیٰ عرش ربّی وقد وضع للحساب وکانّی انظر الیٰ اھل الجنۃ یتزاورون فی الجنۃ وکانّی اسمع عواء اھل النّار فی النار۔ فقال رسول اللہ : عبدٌ نوّر اللہ قلبہ۔ (وافی تالیف فیض۔ جزء سوم صفحہ ۳۳)

ترجمہ : حضرت ابو عبداللہ ؑ نے فرمایا : رسول اکرم ؐ نے حارثہ بن مالک بن نعمان انصاری کی طرف چہرہ مبارک کیا اور فرمایا : اے حارث بن مالک تمہارا کیا حال ہے ؟ اس نے عرض کیا : اے خدا کے رسول ؐ، میں حقیقی مومن ہوں۔ رسول خدا ؐ نے فرمایا : ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تیری بات کی کیا حقیقت ہے ؟ حارث نے کہا۔ اے پیغمبر خدا ؐ، میں نے دنیا سے قطع تعلق کرلیا ہے اور راتوں کو بیدار رہتا ہوں، میں نے اپنی خواہشات کو ختم کر دیا ہے اور اب ایسا محسوس کرتا ہوں کہ خدا کے عرش کو دیکھ رہا ہوں اور بہشتی لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور گویا دوزخیوں کی آہ وزاری سن رہا ہوں۔ پیغمبر خدا ؐ نے فرمایا : حارث خدا کا ایسا بندہ ہے کہ خدا نے اس کے دل کو روشن اور منور کر دیا ہے۔

۲ــ کیونکہ وہ (امام اور پیغمبر) سب سے پہلے مذاہب کے رہبر اور پیشوا ہوتے ہیں اس لئے سب سے افضل ہوتے ہیں۔

۳ــ جو شخص خدا کے حکم سے ایک امت یا قوم کی رہبری اور رہنمائی کا عہدیدار ہوتا ہے، جیسا کہ وہ تمام ظاہری اعمال کی رہبری اور ہدایت کا ذمہ دار ہوتا ہے، اسی طرح معنوی زندگی کے مراحل میں بھی ہدایت اور حقیقی اعمال اسی کی ہدایت سے انجام پاتے ہیں۔[۱]

ائمہ اطہارؑ اور اسلام کے دینی پیشوا

گزشتہ ابواب سے حاصل شدہ نتائج کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد امت اسلامی کے درمیان ہمیشہ ایک امام (مذہبی اور دینی راہنما جو خدا کی طرف سے منصوب ہو) یا دینی رہنما خدا کی طرف سے موجود رہا ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

ان اماموں کی تعداد کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ سے بہت زیادہ[۲] احادیث نقل ہوئی ہیں کہ

۱ــ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (سورۂ انبیاء آیت ۷۳)

ترجمہ: ہم نے ان کو امام بنایا ہے تاکہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں اور نیک کام کرنے کے لئے ان پر وحی نازل کی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (سورہ سجدہ آیت ۲۴)

ترجمہ: ہم نے ان میں سے بعض کو امام بنایا ہے تاکہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں، کیونکہ انہوں نے صبر کیا ہے۔

اس قسم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام، ظاہری ہدایت و راہنمائی کے علاوہ ایک قسم کی معنوی اور باطنی ہدایت کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے جو عالم امر اور وحدانیت کی قسم میں سے ہے اور حقیقت و نور باطنی کے ذریعے اچھے اور نیک انسانوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور ان کو کمال کے درجے کی طرف لے جاتی ہے۔

۲ــ نمونے کے طور پر: عن جابر بن سمرة، قال سمعت رسول الله ؐ يقول: لا يزال هذا الدين عزيزاً الى اثنى عشر خليفة. قال فكبّر الناس وضجّوا ثمّ قال كلمة خفيّة. قلت لابي: يا ابه، ما قال، قال: كلّهم من قريش۔ (صحیح ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۰۷، مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۹۲ اور اسی مضمون کے قریب قریب کئی دوسری احادیث بھی ملتی ہیں) ترجمہ: جابر بن سمرة کہتے ہیں کہ میں نے (باقی اگلے صفحے پر)

یہ سب کے سب قریش خاندان اور پیغمبر اکرمؐ کے اہلبیتؑ میں سے ہوں گے اور حضرت مہدی موعودؑ بھی انہی میں سے ایک اور آخری امام ہوں گے۔

اور اسی طرح پیغمبر اکرمؐ سے بہت سی احادیث[1] حضرت علیؑ کی جانشینی اور امامت کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ حضرت علیؑ ان اماموں میں سے پہلے امام ہیں اور اس طرح آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ سے احادیثِ ثقہ دوسرے اور تیسرے امام کے بارے میں بھی نقل ہوئی ہیں اور پھر گزرے ہوئے اور آئندہ آنے والے اماموں کے بارے میں بھی قطعی اور ثقہ احادیث موجود ہیں۔

ان احادیث کے مطابق شیعہ اماموں کی تعداد بارہ (۱۲) ہے اور ان کے نام یہ ہیں :-

---

رسول خداؐ سے سنا کہ فرماتے تھے : یہ دین میرے بعد بارہ جانشینوں کے آنے تک ہمیشہ باقی رہے گا۔ جابر نے کہا کہ اس وقت لوگوں نے تکبیر کہی اور پھر رسول اللہؐ نے پوشیدہ طور کچھ بیان فرمایا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہؐ نے کیا فرمایا ہے؟ میرے والد نے کہا۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ بارہ امام سب قریش میں سے ہوں گے۔

عن سلمان الفارسی قالَ : دخلتُ علی النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاذا الحسین علی فخذیہ وھو یقبل عینیہ ویقبل فاہ ویقول : انت سیّد ابن سیّد وانت امام ابن امام و انت حجّة ابن حجة وانت ابو حجج تسعة ، تاسعھم قائمھم (ینابیع المودہ تالیف سلیمان ابن ابراہیم قندوزی طبع ہفتم صفحہ ۳۰۸) ترجمہ : سلمان فارسی کہتے ہیں : میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا تو دیکھا کہ آپؐ نے حسینؑ کو اپنی گود میں بٹھایا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں اور چہرے کو چوم رہے تھے اور فرماتے تھے : تم سردار ہو اور سردار کے بیٹے ہو، تم امام ہو اور امام کے بیٹے ہو۔ تم حجت ہو اور حجت کے فرزند ہو اور تم نو اماموں کے باپ ہو کہ ان میں سے نواں قائم ہے۔

[1] کتاب الغدیر تالیف امینی ، کتاب غایۃ المرام تالیف سیّد ہاشم بحرانی ، کتاب اثبات الہداۃ تالیف محمد بن حسن حر عاملی ، ذخائر العقبیٰ تالیف محبّ الدین احمد بن عبداللہ طبری ، مناقب تالیف خوارزمی ، تذکرۃ الخواص تالیف ابن جوزی ، ینابیع المودت تالیف سلیمان ابراہیم قندوزی حنفی ، فصول المہمہ تالیف ابن صباغ ، دلائل الامامت تالیف محمد بن جریر طبری ، النص والاجتہاد تالیف شرف الدین موسوی ، اصول کافی جلد اول تالیف محمد بن یعقوب کلینی ، کتاب الارشاد تالیف مفیدؒ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ علی ابن ابی طالبؑ
۲۔ حسن بن علیؑ
۳۔ حسین بن علیؑ
۴۔ علی بن حسینؑ (زین العابدین)
۵۔ محمد بن علیؑ (باقر)
۶۔ جعفر بن محمدؑ (جعفر صادق)
۷۔ موسیٰ بن جعفرؑ (موسیٰ کاظم)
۸۔ علی بن موسیٰؑ (موسیٰ رضا)
۹۔ محمد بن علیؑ (محمد تقی)
۱۰۔ علی بن محمدؑ (علی نقی)
۱۱۔ حسن بن علیؑ (حسن عسکری)
۱۲۔ محمد بن حسنؑ (قائم المہدی)

بارہ اماموں کی زندگی پر اجمالی نظر

امام اوّلؑ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پہلے امام ہیں۔ آپ حضرت ابوطالب کے بیٹے تھے جو بنی ہاشم خاندان کے معتبر فرد تھے اور پیغمبر اکرمؐ کے حقیقی چچا بھی تھے جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو اپنی زیر سرپرستی لے کر اپنے گھر میں جگہ دی اور ان کی دیکھ بھال اور پرورش کی تھی۔ آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد وہ جب تک زندہ رہے انہوں نے آنحضرتؐ کی حمایت کرتے ہوئے عربی کفار اور خاص کر قریش کے حملوں اور شرارتوں سے آپؐ کو محفوظ رکھا۔

حضرت علیؑ (مشہور قول کے مطابق) آنحضرت کی بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے اور ابھی چھ سال کے ہی تھے کہ شہر مکّہ اور گرد و نواح میں سخت قحط پڑا، اس لئے پیغمبر اکرمؐ کی خواہش کے مطابق آپ اپنے آبائی گھر سے اپنے چچازاد بھائی رسول خداؐ کے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ کی براہ راست سرپرستی میں پرورش پائی۔[1]

---

[1] فصول المہمہ طبع دوم صفحہ ۱۴۔ مناقب خوارزمی صفحہ ۱۷۔

چند سال بعد جب پیغمبر اکرمؐ کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے نبوّت عطا ہوئی اور پہلی بار غارِ حرا میں آپؐ پر آسمانی وحی نازل ہوئی تو آپؐ غارِ حرا سے شہر اور گھر کی طرف تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علیؑ سے تمام واقعہ بیان کیا تو حضرت علیؑ فوراً آپؐ پر ایمان لے آئے۔[1]

اس کے بعد پھر جب پیغمبر اکرمؐ نے اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو جمع کر کے دینِ مبین کی دعوت دی تو اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "جو شخص سب سے پہلے میری دعوتِ دین قبول کرے گا، وہی میرا خلیفہ، وصی اور وزیر ہوگا۔" جو شخص سب سے پہلے اپنی جگہ سے اٹھا اور بآوازِ بلند ایمان لایا وہ حضرت علیؑ ہی تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی ان کے ایمان کو قبول کر لیا اور ان کے بارے میں اپنے وعدے پورے کئے۔[2]

اس لحاظ سے حضرت علیؑ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لائے اور سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہرگز خدائے وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی اور کی پرستش اور عبادت نہیں کی۔

حضرت علیؑ ہمیشہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب آنحضرتؐ نے مکّہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اس رات بھی جبکہ کفارِ مکّہ نے آنحضرتؐ کے مکان کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور پختہ ارادہ کئے ہوئے تھے کہ رات کے آخری حصے میں آنحضرتؐ کے گھر میں داخل ہو کر آپؐ کو بستر مبارک پر ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے بستر مبارک پر سو گئے، اور آپؐ گھر سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے[3] اور پھر آنحضرتؐ کے بعد آپؐ کی وصیّت کے مطابق لوگوں کی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس لوٹا کر اپنی والدہ ماجدہ، پیغمبر اکرمؐ کی بیٹی (حضرت فاطمہؑ)

---

[1] ذخائر العقبیٰ طبع قاہرہ ۱۳۵۶ھ صفحہ ۵۸۔ مناقب خوارزمی طبع نجف ۱۳۸۵ھ صفحہ ۱۶-۲۲۔
ینابیع المودۃ طبع ہفتم صفحہ ۶۸-۷۲۔

[2] ارشاد مفید، طبع تہران ۱۳۷۷ھ صفحہ ۴۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۱۲۲۔

[3] فصول المہمہ صفحہ ۲۸-۳۰۔ تذکرۃ الخواص طبع نجف ۱۳۸۳ھ صفحہ ۳۴۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۱۰۵۔ مناقب خوارزمی صفحہ ۷۳-۷۴۔

اور گھر کی دوسری عورتوں کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔[1]

مدینہ منورہ میں بھی آپؑ ہمیشہ پیغمبر خداؐ کے ساتھ رہے اور آنحضرتؐ نے کبھی بھی، کیا تنہائی میں اور کیا مجلس میں علیؑ کو اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے اور اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؑ کی شادی ان کے ساتھ کر دی اور ایسے ہی جب آنحضرتؐ اپنے اصحاب کے درمیان دوستی اور برادری کا معاہدہ کرتے تو حضرت علی کو اپنا بھائی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔[2]

حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کی تمام جنگوں میں شرکت کی اور ہر جنگ میں حاضر رہے، سوائے جنگِ تبوک کے، کیونکہ اس وقت آنحضرتؐ نے ان کو مدینہ میں اپنی جگہ پر قائم مقام کے طور پر مقرر فرمایا تھا، لہٰذا حضرت علیؑ نہ تو کبھی کسی جنگ میں پیچھے رہے اور نہ ہی کبھی کسی دشمن سے شکست کھائی اور نہ ہی کسی کام میں پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت کی۔ جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ علیؑ ہرگز حق سے جدا نہیں، اور حق علیؑ سے جدا نہیں ہے۔[3]

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے وقت آپ کی عمر تینتیس ۳۳ سال کی تھی اور اگرچہ تمام فضائل دینی میں سب سے بڑھ کر تھے اور تمام اصحاب کے درمیان ممتاز تھے۔ پھر بھی اس بہانے سے کہ آپ جوان ہیں اور پیغمبر اکرمؐ نے زمانے میں چونکہ جنگوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور سب سے آگے ہوتے تھے، ان جنگوں میں خونریزی کی وجہ سے لوگ آپ کے مخالف اور دشمن ہیں، ان کو خلافت سے الگ کر دیا گیا اور اس طرح آپ عمومی کاموں میں حصہ نہ لے سکے اور گھر میں گوشہ نشین ہو کر اشخاص کی تربیت کرنے لگے۔ آپ پچیس ۲۵ سال تک یعنی پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد تین خلفاء کی خلافت کے زمانے میں حکومت اور خلافت سے بالکل الگ تھلگ رہے اور خلیفہ سوم کے قتل

---

[1] فصول المہمہ صفحہ ۳۴۔

[2] فصول المہمہ صفحہ ۲۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۲۰-۲۴۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۶۳-۶۵۔

[3] تذکرۃ الخواص صفحہ ۱۸۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۱۔ مناقب خوارزمی صفحہ ۴۷۔

[4] مناقب آل ابیطالب تالیف محمد بن علی بن شہر آشوب طبع قم جلد ۳ صفحہ ۶۲، ۲۱۸۔ غایۃ المرام صفحہ ۵۳۹۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۱۰۴۔

کے بعد عوام نے آپ کو خلیفہ منتخب کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

حضرت علیؑ اپنے زمانۂ خلافت میں جو تقریباً چار سال نو مہینے جاری رہا، پیغمبر اکرمؐ کی سیرت اور روش پر عمل پیرا رہے اور آپ نے اپنی خلافت کو ایک تحریک یا انقلاب میں تبدیل کر دیا اور اس کے ساتھ اصلاحات بھی شروع کیں۔ لیکن چونکہ یہ اصلاحات بعض مفاد پرست لوگوں کے نقصان میں تھیں اس لئے بعض اصحاب پیغمبرؐ نے جن میں آگے آگے "حضرت عائشہ"، طلحہ، زبیر اور معاویہ تھے، خلیفۂ سوم کے خون کو بہانہ بنا کر آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور اس طرح انہوں نے شورش، بغاوت اور نافرمانی شروع کر دی۔

حضرت علیؑ نے اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے ام المومنین عائشہ، طلحہ اور زبیر کے ساتھ بصرہ کے نزدیک جنگ کی جو "جنگ جمل" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک دوسری جنگ معاویہ کے ساتھ عراق اور شام کی سرحد پر لڑی جس کو "جنگِ صفین" کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ ڈیڑھ سال تک جاری رہی، اس طرح ایک اور جنگ نہروان کے علاقے میں خوارج کے ساتھ کی جس کو "جنگِ نہروان" کہتے ہیں۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں زیادہ وقت داخلی شورشوں اور فتنوں کو فرو کرنے میں گزرا، تھوڑے ہی عرصے بعد ماہ رمضان کی انیس تاریخ کی صبح ۴۰ھ کو مسجد کوفہ میں نماز پڑھتے ہوئے بعض شکست خوردہ خوارج کے ہاتھوں آپ کو سر پر کاری زخم لگا اور آپ اکیس ماہ رمضان کی رات کو آپ شہادت پا گئے[1]

امیر المومنین حضرت علیؑ، تاریخی شہادت اور دوست و دشمن کے اعتراف و قول کے مطابق انسانی کمالات میں بالکل بے عیب تھے اور اسی طرح فضائلِ اسلامی میں بھی آپ پیغمبر اکرمؐ کی تربیت کا بہترین نمونہ تھے۔

آپ کی شخصیت کے بارے میں جو بحثیں ہوئی ہیں اور ان کے متعلق سنی اور شیعہ حضرات اور دنیا کے محققین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں، کسی اور شخصیت کے بارے میں نہیں لکھی گئی ہیں۔

---

[1] مناقب آل ابیطالب جلد ۳ صفحہ ۳۱۲۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۱۳-۱۲۳۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۱۷۲-۱۸۳۔

حضرت علیؑ علم و دانش میں پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب اور تمام مسلمانوں میں سب سے دانا اور عقلمند تھے۔ آپ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے علمی بیانات میں آزاد عقلی استدلال اور دلیل و برہان کا راستہ کھولا اور معارف اسلامی میں فلسفیانہ بحث کو جاری کیا اور قرآن کریم کے باطن کے متعلق موضوعات کو بیان فرمایا۔ ان سب کے علاوہ قرآنی الفاظ کی حفاظت کے لئے آپ نے عربی زبان میں ایک گرامر بھی لکھی۔ آپ فن تقریر میں بھی اعلیٰ پایہ کی شخصیت رکھتے تھے (جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصے میں بھی اشارہ کیا گیا ہے) حضرت علیؑ شجاعت اور بہادری میں ضرب المثل تھے۔ ان تمام جنگوں میں جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں یا آپؐ کے بعد لڑی گئیں آپ نے سب میں شرکت کی اور کبھی خوف و دہشت اور اضطراب آپ کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ پائے اگرچہ بارہا ان واقعات و حوادث سے جو جنگِ اُحد، جنگِ حنین، جنگِ خیبر اور جنگ خندق میں پیش آئے پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا یا ان میں سے بعض منتشر اور فرار ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کفار اور جنگی ناموروں میں سے کوئی آپ کے ساتھ مقابلہ کرے اور زندہ بچ جائے، اسی طرح بہادری اور شجاعت کے باوجود آپ کسی کمزور کو قتل نہیں کرتے تھے اور میدانِ جنگ سے بھاگ جانے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی شبخون مارتے اور نہ ہی دشمن کیلئے پانی بند کرتے تھے

یہ امر تاریخی حقائق میں سے ہے کہ حضرت علیؑ نے جنگِ خیبر میں ایک زبردست حملہ کیا اور قلعے کے دروازے کے حلقے میں ہاتھ ڈال کر ایک جھٹکے کے ساتھ قلعے کا دروازہ اکھاڑ کر دور پھینک دیا تھا۔[1]

اسی طرح فتح مکّہ کے دن جب پیغمبر اکرمؐ نے بتوں کو توڑ دینے کا حکم صادر فرمایا تھا تو بُت "ھبل" جو مکّہ کے سب سے بڑے بتوں میں شمار ہوتا تھا، بہت بھاری اور بڑے پتھر سے بنا ہوا تھا اور کعبے کے عین اوپر نصب کیا گیا تھا۔ حضرت علیؑ، پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے آپؐ کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے اور بت ہبل کو وہاں سے اکھاڑ کر نیچے پھینک دیا تھا۔[2]

---

[1] تذکرۃ الخواص صفحہ ۲۷۔

[2] تذکرۃ الخواص صفحہ ۲۷۔ مناقب خوارزمی۔ صفحہ ۷۱۔

حضرت علیؑ دینی تقویٰ اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ جو لوگ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آکر حضرت علیؑ کی تندی اور سختی کی شکایت کیا کرتے تھے، آپؐ ان سے فرماتے کہ علیؑ کا گلہ نہ کرو، اور نہ ہی ان کو ملامت اور سرزنش کرو کیونکہ وہ خدا کا عاشق ہے۔ [1]

ابو درداء صحابی نے ایک دفعہ حضرت علیؑ کی لاش کو مدینہ کے ایک نخلستان میں دیکھا کہ لکڑی کی طرح خشک پڑی ہوئی ہے۔ وہ آپ کے گھر اطلاع دینے آئے اور آپ کی بیوی (حضرت فاطمۃ الزہراؑ جو پیغمبر اکرمؐ کی پیاری بیٹی تھی) کے ساتھ افسوس اور تعزیت کا اظہار کیا اور ان کے شوہر کی وفات کی خبر دی۔ پیغمبر اکرمؐ کی بیٹی نے فرمایا: میرے چچا کا بیٹا مرا نہیں ہے بلکہ عبادت کے دوران خوفِ خدا سے ان پر غشی کی حالت طاری ہوگئی ہے اور اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

حضرت علیؑ کی اپنے ماتحتوں کے ساتھ مہربانی، غریب اور بے چارے لوگوں کے ساتھ ہمدردی، غریبوں اور فقیروں کے ساتھ کرم و سخاوت کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ آپ کے ہاتھ جو کچھ بھی آتا تھا اس کو خدا کی راہ میں غریبوں اور بیکس لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے تھے اور خود بڑی تنگی میں بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ آپ کھیتی باڑی کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔ لیکن جس زمین کو آباد کرتے یا جو کاریز بناتے تو اس کو غریبوں اور فقیروں کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ آپ کی وقف شدہ ملکیت کو "وقفِ علیؑ" کہا جاتا ہے۔ اور آپ کے آخری زمانے میں اس وقف شدہ ملکیت سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی جو تقریباً ۲۴ ہزار دینار (سونے کا سکہ) سالانہ تھی۔ [2]

امام دوّمؑ

امام حسن علیہ السلام اور آپ کے چھوٹے بھائی امام حسین علیہ السلام، امیر المومنین حضرت علی کے بیٹے اور پیغمبر اکرمؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے بطن مبارک سے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے بارہا فرمایا

---

[1] مناقب آل ابیطالب جلد ۳ صفحہ ۲۲۱۔ مناقب خوارزمی صفحہ ۹۲۔

[2] نہج البلاغہ حصہ ۳ کتاب (خطبہ) ۲۴۔

کہ حسنؑ و حسینؑ میرے بیٹے ہیں اور اسی وجہ سے حضرت علیؑ اپنے تمام بیٹوں سے فرمایا کرتے تھے: تم میرے بیٹے ہو اور حسنؑ و حسینؑ رسولِ خداؐ کے بیٹے ہیں۔ [1]

امام حسن مجتبیٰؑ کی ۳ ہجری قمری کو مدینہ میں ولادت ہوئی۔ [2] انہوں نے سات سال اور کچھ مہینے تک اپنے نانا (رسول خداؐ) کا زمانہ دیکھا اور آنحضرتؐ کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی۔ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد جو حضرت فاطمۃ الزہراءؑ کی وفات سے تین یا چھ مہینے پہلے ہوئی، آپ اپنے والد ماجد کے زیر تربیت آگئے تھے۔

حضرت امام حسن مجتبیٰؑ اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور حضرت علیؑ کی وصیّت کے مطابق امامت کے درجے پر فائز ہوئے اور ساتھ ساتھ ظاہری خلافت کے عہدیدار بھی بنے۔ تقریباً چھ ماہ تک آپ مسلمانوں کے خلیفہ رہے اور امور مملکت کا نظم و نسق سنبھالے رہے۔ اسی مدّت میں معاویہ جو حضرت علیؑ اور آپ کے خاندان کا سخت ترین دشمن تھا اور کئی سال سے خلافت کی حرص و خواہش میں (سب سے پہلے خلیفہ سوم کے خون کے بدلے کے بہانے اور آخرکار خلافت کا دعویدار ہونے کی وجہ سے) اس نے کئی جنگیں بھی کی تھیں اور کئی بار عراق پر چڑھائی کی تھی جو اس زمانے میں امام حسنؑ کا دارالخلافہ تھا۔ اس طرح آپ سے جنگ شروع کر رکھی تھی۔ دوسری طرف اس نے امام حسنؑ کے فوجی جرنیلوں اور سپاہیوں کو بہت زیادہ پیسہ اور مستقبل کے جھوٹے وعدے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس طرح اس نے ان کو امام حسنؑ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا تھا۔ [3]

آخرکار امام حسنؑ صلح پر مجبور ہو کر اس شرط پر ظاہری خلافت سے دستبردار ہو گئے کہ معاویہ کے مرنے کے بعد خلافت دوبارہ امام حسنؑ کو واپس مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ان کے خاندان

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۱ صفحہ ۲۱-۲۵ - ذخائر العقبیٰ صفحہ ۶۷ اور ۱۲۱۔

[2] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۲۸ - دلائل الامامت تالیف محمد بن جریر طبری طبع نجف ۱۳۶۹ھ صفحہ ۶۰۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۳۳ تذکرۃ الخواص صفحہ ۱۹۳۔ تاریخ یعقوبی طبع نجف ۱۳۱۴ھ جلد ۲ صفحہ ۲۰۴۔ اصول کافی جلد اول صفحہ ۴۶۱۔

[3] ارشاد مفید صفحہ ۱۷۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۳۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۴۴۔

اور طرفداروں کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں گی۔[۱]

اس طرح معاویہ نے اسلامی خلافت پر قبضہ کرلیا اور عراق میں داخل ہوکر ایک عام سرکاری تقریر میں صلح کی شرائط کو منسوخ کر دیا۔[۲] اس نے ہر ممکن ذریعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہلبیتؑ اور ان کے طرفداروں پر سختیاں شروع کر دیں۔

امام حسن علیہ السلام نے اپنی امامت کے تمام عرصے میں جو کہ دس سال کا تھا، بہت ہی سیاسی گھٹن اور سختی میں زندگی گزاری۔ اور ان کے لئے یا ان کے خاندان حتیٰ کہ ان کے گھر کے اندر بھی ان کے لئے جائے امن نہ تھی۔ آخرکار ۵۰ ھ میں معاویہ کے اکسانے پر آپ کی بیوی (جعدہ) نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔[۳]

امام حسنؑ انسانی کمالات میں اپنے والدگرامی کا کامل نمونہ اور اپنے نانا بزرگوار کی نشاتی تھے۔ جب تک پیغمبر اکرمؐ زندہ رہے، آپ اور آپ کے بھائی (امام حسینؑ) ہمیشہ آنحضرتؐ کے پاس رہتے تھے اور آنحضرتؐ کبھی کبھی ان کو اپنے کندھوں پر سوار کر لیا کرتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ سے عام و خاص نے بہت زیادہ احادیث بیان کی ہیں کہ آپؐ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں فرمایا:۔[۴]

"یہ دونوں میرے بیٹے امام ہیں، خواہ وہ اٹھیں یا بیٹھیں"۔ (کنایہ ہے ظاہری خلافت کے عہدیدار ہونے یا نہ ہونے کا) اور حضرت امیرالمومنین علیؑ اور پیغمبر اکرمؐ سے بھی آپ کے والد بزرگوار کی خلافت کے بعد آپ کی جانشینی کے بارے میں بھی بہت زیادہ احادیث موجود ہیں۔

---

[۱] ارشاد مفید صفحہ ۱۷۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۳۔ الامامت والسیاست تالیف عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ جلد اوّل صفحہ ۱۶۳۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۴۵۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۱۹۷۔

[۲] ارشاد مفید صفحہ ۱۷۳۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۵۔ الامامت والسیاست جلد ۱ صفحہ ۱۶۴۔

[۳] ارشاد مفید صفحہ ۱۷۴۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۴۲۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۴۶۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۲۱۱۔

[۴] ارشاد مفید صفحہ ۱۸۱، اثبات الہداۃ جلد ۵ صفحہ ۱۲۹ و ۱۳۴۔

امام سوّم ؑ

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام، حضرت علیؑ اور رسول خداؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ ؑ کے دوسرے فرزند تھے۔ آپ کی ولادت ۴ ہجری میں ہوئی۔ اپنے بڑے بھائی امام حسن مجتبیٰ ؑ کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور دوسرے امامؑ کی وصیّت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔[1]

امام حسینؑ نے دس سال امامت کی اور اس تمام عرصے میں صرف تقریباً چھ مہینے کی مدّت کے علاوہ جو معاویہ کی خلافت کے آخری دنوں میں تھی، بہت ہی سخت حالات اور سیاسی گھٹن کی حالت میں زندگی گزاری، کیونکہ اس زمانے میں دینی اصول و قوانین کی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور حکومتی قوانین و احکام، خدا اور رسولؐ کے احکام کے جاگزین ہو چکے تھے۔ ادھر معاویہ اور اس کے ساتھی اہلبیتؑ اور ان کے پیروکاروں کو ختم و نابود کرنے اور اسی طرح علیؑ اور اہلبیت کا نام مٹانے کے لئے ہر کوشش اور امکان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ معاویہ اپنے بیٹے یزید کی خلافت کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور لوگوں کی ایک بڑی جماعت یزید کی بے راہ روی اور بے رویّہ آزادی کی وجہ سے اس سے خوش نہیں تھی۔ ادھر معاویہ اس مخالفت کو روکنے کے لئے ہر قسم کی سختی کر رہا تھا۔

امام حسینؑ مجبوراً اس تاریک دور میں زندگی گزار رہے تھے اور ہر قسم کی سختیوں، روحانی شکنجوں اور اذیّتوں کو جو معاویہ اور اس کے پیروکاروں کی طرف سے آپ پر وارد ہوتی تھیں، برداشت کر رہے تھے یہاں تک کہ ۶۰ھ میں معاویہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا یزید اس کی جگہ بادشاہ بن گیا۔[2]

---

[1] ارشاد مفید صفحہ ۱۷۹۔ اثبات الہداۃ جلد ۵ صفحہ ۱۶۸، ۲۱۲۔ اثبات الوصیۃ تالیف مسعودی طبع تہران ۱۳۲۰ھ قمری صفحہ ۱۲۵

[2] ارشاد مفید صفحہ ۱۸۲۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۶-۲۲۸۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۶۳۔

بیعت کرنا ایک عربی رسم تھی جو اہم کاموں مثلاً سلطنت اور امارات میں جاری تھی اور ماتحت یا خاص کر مشہور لوگ اپنے سلطان، بادشاہ یا امیر کے ہاتھ پر بیعت کیا کرتے تھے اور اس طرح اپنی وفاداری، اطاعت اور موافقت کا اظہار کرتے تھے اور پھر بیعت کے بعد مخالفت کرنا قومی غدّاری اور شر مساری شمار کی جاتی تھی اور یہ مخالفت ایک قطعی اور مضبوط معاہدے کی خلاف ورزی اور جرم کے مترادف تھی۔ اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت میں بھی مجموعی طور پر وہی بیعت قابل قبول ہوتی تھی جو پورے اختیار اور کسی دباؤ کے بغیر ہو، نہ کہ دباؤ کے ذریعے۔

معاویہ نے بھی قوم کے بڑے بڑے اور مشہور لوگوں سے یزید کے لئے بیعت حاصل کر لی تھی لیکن امام حسینؑ پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا یا ان سے بیعت کے لئے نہیں کہا گیا تھا اور نہ ہی یزید کی بیعت امام حسینؑ کے لئے فرض کی گئی تھی۔ اس نے یزید کو خصوصاً نصیحت اور وصیت کی تھی کہ[1] اگر حسین ابن علی تمہاری بیعت سے انکار کرے تو زیادہ اصرار نہ کرنا اور خاموشی اور چشم پوشی سے کام لینا، کیونکہ وہ اس مسئلے میں کافی تحقیق کر چکا تھا اور کام کے سخت نتائج کو اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔

لیکن یزید اپنے غرور و تکبّر اور دیدہ دلیری میں اپنے باپ کی نصیحت کو بھول چکا تھا اور اس نے اپنے باپ کی وفات کے فوراً بعد مدینے کے حاکم یا والی کو حکم دیا کہ امام حسینؑ سے اس کی بیعت لے ورنہ ان کا سر کاٹ کر شام بھیجا جائے۔[2]

جب مدینے کے حاکم نے یزید کی خواہش کو امام حسینؑ کے سامنے بیان کیا تو امام حسینؑ نے اس پر غور کرنے کے لئے کچھ مہلت چاہی۔ اس کے بعد راتو رات اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ سے مکّہ چلے آئے اور حرم کعبہ اور خانۂ خدا میں جو روایتی پناہ گاہ تھی، پناہ گزین ہو گئے۔

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۸۸۔

[2] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۸۸۔ ارشاد مفید صفحہ ۱۸۲۔ الامامت والسیاست جلد ایک صفحہ ۲۰۳۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۹۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۶۳۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۲۳۵۔

یہ واقعہ ۶۰ ہجری قمری کو ماہ رجب کے آخر یا شعبان کے شروع میں پیش آیا تھا اور امام حسینؑ چار مہینے تک شہر مکہ میں پناہ گزین کے طور پر زندگی گزارتے رہے۔ آہستہ آہستہ یہ خبر تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ ایک طرف تو وہ لوگ جو معاویہ کے زمانۂ خلافت میں اس کے ظلم وستم کی وجہ سے ناراض تھے اور پھر یزید کی خلافت نے ان کی ناراضگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، امام حسینؑ سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور دوسری طرف عراق خصوصاً شہر کوفہ سے یکے بعد دیگرے خطوط آرہے تھے جن میں امام حسینؑ کو عراق آنے اور ان لوگوں کی قیادت سنبھالنے کی دعوت دی گئی تھی، تاکہ ظلم وستم کو ختم کرنے کے لئے انقلاب برپا کریں، لیکن یہ واقعات یزید اور اسکی حکومت کیلئے سخت خطرہ تھے۔

مکہ معظمہ میں امام حسینؑ کا قیام جاری تھا، یہاں تک کہ حج کا زمانہ آگیا اور دنیا کے مسلمان گروہ در گروہ اور جوق در جوق مکہ میں آنا شروع ہو گئے اور حج کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس وقت حضرت امام حسینؑ کو اطلاع ملی کہ یزیدی لوگوں کی ایک جماعت حاجیوں کی شکل میں مکہ میں داخل ہو گئی ہے، جن کو مامور کیا گیا تھا کہ اپنے احرام کے نیچے ہتھیاروں کے ذریعے فریضۂ حج کے دوران امام حسینؑ کو شہید کر دیں۔[1]

امام حسینؑ نے فریضۂ حج کو مختصر طور پر ادا کرتے ہوئے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے لوگوں کی ایک جماعت کے سامنے مختصر سی تقریر کرتے ہوئے،[2] عراق کی جانب جانے کی اطلاع دی۔ آپ نے اپنی شہادت کی خبر بھی دی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں سے مدد کی درخواست بھی کی کہ اس اہم کام میں ان کی مدد کریں اور خدا کی راہ میں اپنا خون بہا دیں (جہاد کریں) اس سے اگلے دن آپ اپنے خاندان اور چند ساتھیوں کے ساتھ عراق کی طرف چل پڑے۔

امام حسینؑ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ ہرگز یزید کی بیعت نہیں کریں گے اور یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ بیعت سے انکار کرنے کے بعد قتل ہو جائیں گے اور بنی امیہ کی دہشتناک جنگی فوج جو عمومی بدعنوانیوں اور فکری تنزل میں رچی بسی ہوئی ہے حتماً آپ کو شہید کر دے گی

---

[1] ارشاد مفید صفحہ ۲۰۱۔

[2] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۸۹۔

کیونکہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ وہ ہر یزیدی حکم کی ماننے والی ہے اور پھر اہل عراق بھی اس کے حامی اور مددگار ہیں۔

بعض مشہور و معروف افراد نے خیر خواہی اور ہمدردی کے طور پر آپ کا راستہ روک لیا اور آپ کو اس سفر اور تحریک کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا لیکن آپ نے جواب میں فرمایا:

"میں ہرگز بیعت نہیں کروں گا اور ظالم و ستمگر حکومت کی تائید و تصدیق نہیں کروں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جہاں کہیں جاؤں گا یا رہوں گا، مجھے قتل کر دیں گے۔ اور چونکہ میں مکہ معظمہ کو خیر باد کہہ رہا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ڈر یا خوف سے یہاں سے بھاگ رہا ہوں، بلکہ میرے سامنے خانۂ خدا کی حرمت کا خیال ہے تاکہ میرا خون گرنے سے اس پاک گھر کی توہین اور بے حرمتی نہ ہو۔"[1]

امام حسینؑ کوفہ کی طرف چل پڑے۔ ابھی کوفہ پہنچنے میں چند دنوں کا فاصلہ تھا کہ آپ کو اطلاع ملی کہ کوفہ میں یزید کے حاکم نے آپ کے نمائندے (مسلم بن عقیل) اور ایک دوسرے مشہور آدمی (ہانی بن عروہ) کو جو آپ کا طرفدار تھا قتل کر کے ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے بازاروں اور گلیوں میں پھرایا ہے[2] شہر اور گرد و نواح میں پہرے بٹھا دیئے ہیں اور دشمن کی ان گنت فوج آپ کے انتظار میں ہے۔ اس حالت میں شہید ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ یا راستہ ہی نہیں تھا۔ اسی جگہ امام نے پختہ عزم سے فیصلہ کر لیا اور بلا شک و شبہ اپنے قتل اور شہید ہو جانے کی اطلاع بھی سب کو دے دی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنا تاریخی سفر جاری رکھا۔[3]

کوفہ شہر سے تقریباً ۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بیابان تھا جس کو کربلا کہتے تھے۔ یہاں حضرت امام حسینؑ اور آپ کے ساتھی یزیدی فوج کے محاصرے میں آ گئے اور ان کو مجبوراً یہاں

---

[1] ارشاد مفید صفحہ ۲۰۱۔

[2] ارشاد مفید صفحہ ۲۰۴۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۷۰۔ مقاتل الطالبین۔ طبع دوم صفحہ ۷۳۔

[3] ارشاد مفید صفحہ ۲۰۵۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۷۱۔ مقاتل الطالبین صفحہ ۷۳۔

آٹھ دن تک ٹھہرنا پڑا۔ محاصرہ ہر روز تنگ ہوتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی دشمن کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کار حضرت امام حسینؑ اور آپ کے گنتی کے چند ساتھی یزید کی تیس ہزار فوج کے محاصرے میں آ گئے۔ [1]

ان چند دنوں میں امام حسینؑ اپنے موقف پر سختی سے ڈٹے رہے اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں اور اصحاب کے بارے میں بھی فیصلہ کیا۔ آپ نے رات کے وقت اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

"ہمارے سامنے موت اور شہادت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا۔ ان لوگوں کو میرے سوا کسی اور کے ساتھ کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت واپس لیتا ہوں۔ تم میں سے جو شخص بھی چاہے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اس خطرناک بھنور سے اپنی جان بچا سکتا ہے"۔

اس کے بعد آپ کے حکم سے بتیاں بجھا دی گئیں۔ بہت سے لوگ جو دنیاوی مقاصد کے پیشِ نظر آپ کے ساتھ تھے، منتشر ہو کر واپس چلے گئے اور حق کے عاشقوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ (جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی اور امام حسینؑ کے خاص اصحاب پر مشتمل تھی) اور بنی ہاشم خاندان کے چند افراد کے سوا اور کوئی نہ رہا۔

امامؑ نے دوسری بار اپنے خاندان کے افراد کو بلایا اور ان کا امتحان لیتے ہوئے فرمایا:۔

"دشمن صرف میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ تم میں سے جو بھی چاہے، رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مہلک خطرے سے اپنی جان بچا لے"۔

لیکن اس دفعہ امام کے وفادار اصحاب نے مختلف بیانات میں جواب دیئے:۔

"ہم ہرگز حق کے اس راستے سے منہ نہیں پھیریں گے جس کے آپ امام اور رہبر ہیں۔ ہم ہرگز آپ کے دامنِ پاک کو نہیں چھوڑیں گے اور جب تک ہمارے بدنوں میں خون کی آخری رمق باقی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں تلوار موجود ہے، ہم آپ کی حفاظت کریں گے"۔ [2]

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۹۸۔ [2] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۹۹۔ ارشاد مفید صفحہ ۲۱۴۔

دشمن کی طرف سے نویں محرم کو امام حسین علیہ السلام کو "بیعت یا جنگ" کا آخری انتباہ دیا گیا۔ امام حسینؑ نے عبادت کے لئے ایک رات کی مہلت مانگی اور آنے والے کل کی جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔[1]

دسویں محرم الحرام ۶۱ھ کو امام حسینؑ اپنی بہت ہی قلیل تعداد کے ساتھ (جو تقریباً ۹۰ سے کم افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے پچاس افراد آپ کے سابقہ اصحاب اور ساتھی تھے اور تقریباً تیس افراد دن رات کی جنگ میں دشمن کی فوج سے امام حسینؑ کے ساتھ مل گئے تھے اور باقی سب آپ کے ہاشمی رشتے دار، بیٹے، بیٹیاں، بھائی، بہنیں، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے، بھانجیاں اور چچا زاد بھائی بہن شامل تھے) دشمن کے بے انتہا لشکر کے سامنے صف آراء ہو گئے اور اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔

اس دن صبح سے لے کر شام تک جنگ جاری رہی۔ امام، تمام ہاشمی جوان اور ان کے باوفا اور جاں نثار اصحاب یکے بعد دیگرے سب شہید ہو گئے (شہید ہونے والوں میں امام حسنؑ کے دو چھوٹے کمسن بچے، امام حسینؑ کا ایک چھوٹا اور ایک شیر خوار بچہ بھی شامل تھے)[2]

دشمن کی فوج نے جنگ کے بعد امام حسینؑ کے حرم کو لوٹ لیا اور خیموں کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد شہیدوں کے سروں کو ان کے جسموں سے الگ کر کے لاشوں کو بے گور و کفن اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ پھر اہل حرم نے جو کہ بھی بے آسرا و بے وارث مستورات اور بچیاں تھیں، شہیدوں کے ساتھ کوفہ کی طرف کوچ کیا۔ (قیدیوں میں مرد بہت کم تھے۔ ان میں امام حسینؑ کے بائیس سالہ فرزند امام زین العابدین جو سخت بیمار تھے یعنی شیعوں کے چوتھے امام اور ان کے چار سالہ فرزند محمد بن علی (امام باقرؑ) جو بعد میں پانچویں امام ہوئے۔ امام حسنؑ کے بیٹے حسن مثنیٰ (جو کہ امام حسینؑ کے داماد بھی تھے، ان کو جنگ میں کاری زخم آئے تھے اور شہیدوں کے درمیان پڑے

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۹۸ - ارشاد مفید صفحہ ۲۱۴۔

[2] بحار الانوار طبع کمپانی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۲ - ۲۰۳۔

ہوئے تھے، ان کو وہاں سے اٹھا کر قیدی بنالیا تھا۔ ایک سپہ سالار کی سفارش سے ان کی جان بخشی کی گئی تھی) قیدیوں کے ساتھ کوفہ کی طرف لے گئے۔ پھر کوفہ سے دمشق لے جاکر یزید کے دربار میں ان کو حاضر کیا گیا۔

واقعۂ کربلا، اہلبیتؑ کی عورتوں اور لڑکیوں کو شہر بشہر پھرانے اور امیر المومنین حضرت علیؑ کی بیٹی حضرت زینب سلام اللہ علیہا اور امام زین العابدین کی تقاریر نے (جو انہوں نے کوفہ اور شام میں کی تھیں، بنوامیہ کی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا اور ذلیل و خوار کر دیا اور معاویہ کے پروپیگنڈوں کا اثر زائل کر دیا۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یزید نے بھی سب کے سامنے اپنے جرنیلوں اور ماموروں کے عمل سے بیزاری اور تنفرت کا اظہار شروع کر دیا۔ کربلا کا واقعہ ایک اہم عنصر تھا جس کے فوری اثر نے بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور مذہبِ شیعہ کی بنیاد بہت مضبوط ہو گئی۔ اس واقعہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ انقلاب اور شورشیں شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی خونریز جنگوں کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع ہو گیا جو بارہ سال تک جاری رہا۔ جن لوگوں نے امام حسینؑ کے قتل میں شرکت کی تھی ان میں سے ایک شخص بھی انتقام سے نہ بچ سکا۔

جو شخص امام حسینؑ کی زندگی، یزید کی حکومت کی تاریخ اور اس زمانے کے حالات و واقعات پر غور کرے اور تاریخ کے اس حصے میں تحقیق کرے اس کے لئے کوئی شک وشبہ نہیں رہے گا کہ اس وقت امام حسینؑ کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا شہادت کا راستہ۔

یزید کی بیعت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اعلانیہ طور پر اسلام کے اصولوں کو پامال اور قربان کر دیا جائے اور یہ چیز امام حسین علیہ السلام کے لئے ہرگز قابل قبول نہ تھی۔ کیونکہ یزید نہ صرف دینِ مقدّس اسلام اور اس کے اصولوں کا کوئی احترام نہ کرتا تھا اور نہ ہی اسلامی اصولوں کا پابند تھا۔ بلکہ اسلام کے قوانین اور اصولوں کو پامال کرنے میں بھی بے باکانہ اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

اس کے برخلاف اس سے پہلے حکمران اگرچہ اصولوں کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر جو کچھ بھی کرتے دین کے پردے میں انجام دیتے تھے۔ دینی امور کو ظاہری طور پر محترم شمار کیا کرتے تھے۔

اور ساتھ ہی ساتھ پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب ہونے کے لحاظ سے تمام دینی بزرگوں پر فخر کیا کرتے تھے جن کو عوام مانتے تھے۔

جیسا کہ بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ یہ دونوں امام (امام حسنؑ اور امام حسینؑ) مختلف نظریات رکھتے تھے یعنی امام حسن علیہ السلام صلح پسند تھے اور امام حسین علیہ السلام جنگ اور جہاد کو ترجیح دیتے تھے، جیسا کہ ایک بھائی چالیس ہزار جنگی سپاہی رکھتے ہوئے بھی معاویہ کے ساتھ صلح کرلیتا ہے اور دوسرا بھائی صرف چالیس افراد کے ساتھ یزید کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیتا ہے، یہ بات بالکل بے جا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہی امام حسینؑ جو ایک دن یزید کی بیعت پر آمادہ نہ ہوئے تھے، اپنے بھائی امام حسنؑ کی طرح دس سال تک معاویہ کی حکومت میں زندگی گزارتے رہے (کہ وہ بھی دس سال تک معاویہ کی حکومت میں زندگی گزارتے رہے تھے) اور انہوں نے ہرگز مخالفت نہ کی تھی، کیونکہ اگر اس وقت امام حسنؑ اور امام حسینؑ معاویہ کے خلاف جنگ کرتے تو اس میں شک نہیں کہ شہید ہو جاتے مگر اسلام کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، اس لئے کہ معاویہ کی بظاہر حق بجانب سیاست کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو پیغمبر اکرمؐ کا صحابی، کاتب وحی اور خال المومنین کے طور پر تعارف کراتا تھا لیکن دوسری طرف کسی قسم کے فریب سے بھی نہیں چوکتا تھا، اور بالکل کوئی اثر نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ معاویہ اپنے کارندوں کے ذریعے ان دونوں اماموں کو قتل کروا سکتا تھا، اور پھر ان کی سوگواری اور تعزیت کرتے ہوئے ان کا ظاہری انتقام لینے پر بھی آمادہ ہو جاتا، جیسا کہ اس نے خلیفۂ سوم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔

امام چہارمؑ

امام سجادؑ (علی بن حسین، جن کے القاب زین العابدینؑ اور سجاد تھے) چوتھے امام ہیں۔ آپ تیسرے امام (امام حسینؑ) کے فرزند تھے اور ایرانی شہنشاہ یزدجرد کی بیٹی شہربانو کے بطن

سے پیدا ہوئے تھے آپ امام سوم کے اکیلے فرزند تھے جو واقعہ کربلا میں زندہ بچ گئے تھے کیونکہ آپ کے تین بھائی اس جانگداز واقعہ میں شہید ہو گئے تھے۔[1] آپ بھی اپنے والد کے ساتھ کربلا میں تشریف لائے تھے لیکن چونکہ سخت بیمار تھے اور ہتھیار اٹھانے اور جنگ میں شرکت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اسی لئے جہاد اور شہادت میں پیچھے رہ گئے تھے اور حرم کے قیدیوں کے ساتھ شام بھیجدیئے گئے۔

قید کا زمانہ گزارنے کے بعد یزید کے حکم سے عوامی مخالفت کو نرم کرنے کے لئے آپ کو احترام کے ساتھ مدینے بھیج دیا گیا تھا مگر دوبارہ آپ کو اموی خلیفہ عبدالملک کے حکم سے پا بہ زنجیر مدینہ سے شام لایا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد پھر واپس مدینہ تشریف لے آئے۔[2]

امام چہارم مدینہ منوّرہ تشریف لانے کے بعد اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے اور اپنے گھر کے دروازے تمام لوگوں پر بند کر کے خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے اور اپنے خاص شیعوں مثلاً ابو حمزہ ثمالی، ابو خالد کابلی اور ایسے ہی چند دوسرے افراد کے سوا کسی اور سے نہیں ملتے تھے۔ البتہ یہ خاص لوگ اپنے امام سے جو تعلیمات حاصل کرتے، آپ کے پیروکاروں تک پہنچا دیتے تھے اور اس طرح مذہب شیعہ روز بروز ترقی کرتا گیا جس کے بیشتر اثرات پانچویں امام کے زمانے میں رونما ہوئے۔

چوتھے امام کی دعاؤں کی ایک کتاب "صحیفہ کاملہ سجادیہ" کے نام سے مشہور ہے اور یہ ستاون (۵۷) دعاؤں پر مشتمل ہے جن میں بہت ہی گہرے اسرار و معارفِ الٰہی پوشیدہ ہیں اور اسی مجموعے کو "زبورِ آلِ محمدؐ" بھی کہا جاتا ہے۔

امام چہارم کو پینتیس ۳۵ سال کی امامت کے بعد شیعوں کی بعض احادیث کے مطابق اموی خلیفہ ھشام بن عبدالملک کے ایما پر ولید بن عبدالملک نے زہر دیدیا[3] تھا اور آپ ۹۵ ہجری میں وفات پا گئے۔

---

[1] مقاتل الطالبین صفحہ ۵۲ و ۵۹۔

[2] تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۲۴۔ اثبات الہداۃ جلد ۵ صفحہ ۲۴۳۔

[3] مناقب ابن شہر آشوب جلد چہارم صفحہ ۱۷۶۔ دلائل الامامت صفحہ ۸۰۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۹۰۔

امام پنجمؑ

امام محمد بن علی (باقرؑ) پانچویں امام ہیں۔ باقر کے معنی ہیں چیرنے پھاڑنے والا یعنی علم کو چیر کر تحقیق کرنے والا۔ اور یہ لقب آپ کو پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔[1]

آپ چوتھے امام کے بیٹے ہیں اور ۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ واقعہ کربلا میں آپ کی عمر چار سال تھی۔ اس جنگ میں آپ موجود تھے۔ آپ اپنے والد ماجد کے بعد خدا کے حکم اور اپنے آباء و اجداد کے تعارف سے منصبِ امامت پر فائز ہوئے اور ۱۱۴ھ یا ۱۱۷ھ میں (شیعہ اقوال و روایات کے مطابق) [2] ابراہیم بن ولید بن عبدالملک اموی خلیفے کے بھتیجے نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔

پانچویں امام کے زمانۂ امامت میں ایک طرف تو بنی امیہ کے مظالم کی وجہ سے اسلامی ممالک میں ہر روز انقلاب اور جنگیں رونما ہوتی رہتی تھیں اور دوسری طرف خود اموی خاندان میں اختلافات پیدا ہو رہے تھے اور ان مشکلات نے خلافت اور حکومت کو اپنی طرف مشغول کر رکھا تھا۔ اس طرح ایک حد تک وہ اہلبیتؑ پر ظلم کرنے سے باز رہے۔

دوسری طرف واقعہ کربلا اور اہلبیتؑ کی مظلومیت جس کی مثال امام چہارمؑ تھے، ایسے امور تھے جو مسلمانوں کو اہلبیتؑ کا گرویدہ بنا رہے تھے۔ ان حالات و عوامل کی وجہ سے عوام اور خصوصاً شیعہ ایک سیلاب کی مانند پانچویں امامؑ کے پاس مدینہ منورہ میں پہنچ کر اسلامی حقائق اور تعلیمات اہلبیتؑ

---

[1] شیعہ مذہب کی احادیث، روایات اور اعتقادات کے مطابق رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی میں ہی بارہ اماموں کے نام معین کر دیئے تھے اور ہر امام کا لقب بھی دیدیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میری پشت کے پانچویں امام کا نام میرے نام پر محمد ہوگا اور اس کا لقب باقر ہوگا (ترجمہ) ارشاد مفید صفحہ ۲۴۶۔ فصول المہمہ صفحہ ۱۹۳۔ مناقب شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۹۷۔

[2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۶۹۔ ارشاد مفید صفحہ ۲۴۵۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۰۲-۲۰۳۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۶۳۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۴۰۔ دلائل امامت ۹۴۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۲۱۰۔

حاصل کرنے میں پیش پیش تھے اور آپکے پاس لوگوں کا اس قدر مجمع لگا رہتا تھا کہ آپ سے پہلے آئمہ اہلبیتؑ کو ایسا موقع میسّر نہ آسکا تھا۔ اس دعوے کا ثبوت وہ بے شمار احادیث و روایات ہیں جو پانچویں امامؑ سے نقل اور روایت ہوئی ہیں۔ آپ کے بہت زیادہ اصحاب شیعہ دانشمند اور رجالِ علم تھے جو آپ سے مختلف علوم میں فیضیاب ہوئے اور آپ کے معارف اسلامی کے مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے نام آج بھی فہرستوں اور علم رجال کی کتابوں میں درج ہیں[1]۔

امام ششمؑ

امام جعفر بن محمد (صادقؑ) پانچویں امامؑ کے فرزند ہیں جو ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں (شیعہ روایات و اقوال کے مطابق) عباسی خلیفہ منصور کے ایماء پر ان کو زہر دیکر شہید کر دیا گیا[2]۔

چھٹے امامؑ کے عہد خلافت میں اسلامی ممالک میں انقلابات کی وجہ سے اور خاص کر وہ تحریک جو مسوّدہ[3] (سیاہ پوشوں) نے بنو امیّہ کی خلافت کو ختم کرنے کے لئے چلائی تھی اور وہ خونریز جنگیں جو بنو امیّہ کی خلافت کو ختم کرنے کا باعث ہوئیں اور جن کی وجہ سے پانچویں امامؑ کو اپنے بیس سالہ عہدِ امامت میں اسلامی حقائق بیان کرنے اور اہلبیتؑ کی تعلیمات کو عام کرنے کا بہترین موقع ہاتھ

---

[1] ارشاد مفید صفحہ ۲۴۵-۲۵۳۔ دیکھئے کتاب رجال کشی تالیف محمد بن عمر بن عبدالعزیز اور کتاب رجال الطوسی، تالیف محمد بن حسن طوسی۔ کتاب فہرست طوسی اور دوسری کتب رجال۔

[2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۷۲۔ دلائل الامامۃ صفحہ ۱۱۱۔ ارشاد مفید صفحہ ۲۵۴۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۱۱۹۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۱۲۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۴۶۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۲۸۰۔

[3] بنو امیّہ کی خلافت کے خلاف ایران کے صوبہ خراسان سے ایک تحریک اٹھی جس کی قیادت ابو مسلم خراسانی نے کی۔ ابو مسلم خراسانی کے پیروکار سیاہ لباس پہنتے تھے اور مسوّدہ یا اسود کے معنیٰ "کالے" کے ہیں لہٰذا ان کو سیاہ پوش فوج کے نام سے پکارا گیا۔ تاریخِ ایران میں (سیاہ جامگان) کہا جاتا ہے اور یہ تحریک بنو امیہ کے خاتمے اور بنو عباسی خلافت کی طرفدار تھی۔ (مترجم)

آگیا تھا، امام ششمؑ کے لئے بہت ہی مناسب ماحول پیدا ہوگیا تھا تاکہ دینی تعلیمات کی بہترین طریقے سے تبلیغ کرسکیں۔

آپ نے اپنی امامت کے آخری زمانے تک جو بنوامیہ کی خلافت کے خاتمے اور بنو عباس کی خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا، اس فرصت سے خوب فائدہ اٹھایا اور دینی تعلیم و تبلیغ میں مشغول رہے۔ آپ نے مختلف عقلی و نقلی علوم و فنون میں بہت زیادہ دینی اور علمی شخصیتیں پیدا کیں مثلاً زرارہ، محمد بن مسلم، مومن طاق، ھشام بن حکم، ابان بن تغلب، ھشام بن سالم، حریز، ھشام کلبی نسابہ، جابر بن حیان صوفی، شیمیائی وغیرہ جن کو آپ نے فیضیاب کیا اور حتیٰ کہ عام علمی دانشوروں مثلاً سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ (حنفی مذہب کے بانی)، قاضی سکونی، قاضی ابوالبختری وغیرہ کو بھی آپ کی شاگردی کا فخر حاصل رہا ہے (مشہور ہے کہ امام ششمؑ کے مکتبِ علم اور محفلِ درس سے چار ہزار دانشور، محدّث پیدا ہوئے)

وہ احادیث جو "صادقین" یعنی امام پنجمؑ اور امام ششمؑ سے نقل ہوئی ہیں وہ ان تمام احادیث کے برابر ہیں جو پیغمبر اکرمؐ اور دوسرے دس آئمہ علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ ہیں۔

لیکن اپنے آخری دور میں عباسی خلیفہ منصور کے مظالم سے دوچار ہوگئے تھے۔ آپ پر پابندی اور نظر بندی عائد کردی گئی، آپ کو آزار و شکنجے بھی دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی علوی سادات کا اس قدر قتلِ عام کیا گیا کہ بنی امیہ اپنی سفاکی اور ظلم و ستم کے باوجود اس حد تک نہ پہنچے تھے، خلیفہ عباسی منصور کے حکم سے ان کے پیروکاروں کو گروہ در گروہ پکڑ کر جیلوں اور کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان کو بے دریغ شکنجوں اور اذیت کے ساتھ قتل کر دیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کی گردن اڑا دی جاتی تھی، بعض کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور بعض کو زندہ عمارتوں کی دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا۔

عباسی خلیفہ منصور نے چھٹے امامؑ کو گرفتار کرنے کے لئے حکم جاری کیا (امام ششمؑ اس

سے پہلے بھی ایک بار عباسی خلیفہ سفّاح کے حکم سے گرفتار کر کے عراق بھیجے گئے تھے اور اس سے پہلے پانچویں امامؑ کی زندگی میں اموی خلیفہ ھشام کے حکم سے آپ کو دمشق میں گرفتار کیا گیا تھا)

امامؑ مدت تک نظر بند رہے اور کئی بار آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور آپ کی توہین کی گئی لیکن آخر کار آپ کو مدینہ جانے کی اجازت دیدی گئی اور امامؑ واپس مدینہ تشریف لے گئے اور باقی تمام عمر خاموشی سے گوشہ نشینی اور عزلت میں گزار دی، یہاں تک کہ منصور کی چالبازی سے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔[1]

چھٹے امامؑ کی شہادت کی خبر سنتے ہی عباسی خلیفہ منصور نے مدینہ کے والی کو حکم دیا کہ آپ کے وارثوں پر مہربانی کے بہانے امامؑ کے گھر جائے اور آپ کے وصیّت نامے کو لے کر پڑھے اور جس کسی کو آپ کا وصی یا جانشین بنایا گیا ہو اس کی فوراً گردن اتار دی جائے۔ البتہ اس حکم سے منصور کا مطلب یہ تھا کہ امامت کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے اور شیعہ مذہب کی آواز کو مکمل طور پر خاموش کر دیا جائے۔ لیکن اس کی سازش کے برعکس جب مدینہ کے حاکم نے وصیّت نامہ پڑھا تو دیکھا کہ امامؑ نے پانچ افراد کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے یعنی (۱) خود خلیفہ (منصور عباسی) (۲) مدینے کا والی (۳) عبداللہ افطح، امام کے بڑے فرزند (۴) موسیٰؑ امام کے چھوٹے فرزند، (۵) حمیدہ۔[2] اس طرح منصور کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔[3]

امام ہفتمؑ

امام موسیٰ بن جعفر (کاظم) علیہ السلام، چھٹے امام کے بیٹے ہیں جنکی ۱۲۸ ہجری میں ولادت

---

[1] فصول المہمہ صفحہ ۲۱۲۔ دلائل امامت صفحہ ۱۱۱۔ اثبات الوصایہ صفحہ ۱۴۲۔

[2] حمیدہ بربریہ: حضرت امام رضاؑ کی والدہ ماجدہ اور حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی بیوی کا نام ہے (لغت نامہ دھخدا)

[3] اصول کافی جلد اول صفحہ ۳۱۰۔

ہوئی اور ۱۸۳ ہجری میں آپ کو قید خانے میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔[1]

آپ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور آباء واجداد کے تعارف سے امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ساتویں امامؑ، عباسی خلفاء منصور، ہادی، مہدی اور ہارون کے ہمعصر تھے۔ آپ بہت ہی تاریک اور مشکل دور میں خاموشی کے ساتھ (سخت تقیہ کی حالت میں) بہت کٹھن زندگی گزارتے رہے۔ آخر کار جب ہارون الرشید حج کے لئے مدینہ گیا تو اس کے حکم سے امام ہفتمؑ کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب آپ مسجد نبوی کے اندر نماز میں مشغول تھے۔ آپ کو زنجیروں میں جکڑ کر قید میں ڈال دیا گیا اور پھر مدینہ سے بصرہ اور بصرہ سے بغداد لے جایا گیا۔ اس طرح آپ کو کئی سال تک قید میں رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ آخر کار بغداد کے قید خانے میں سندی بن شاہک ملعون نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔[2] آپ "مقابر قریش" میں جو اس وقت کاظمیہ (عراق) میں واقع ہے دفن کئے گئے۔

امام ہشتمؑ

امام علی بن موسیٰ (رضا) علیہ السلام، ساتویں امامؑ کے بیٹے ہیں (مشہور تواریخ کے حوالے سے) ۱۴۸ ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۲۰۳ ہجری میں شہادت ہوئی۔[3]

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۷۶۔ ارشاد مفید صفحہ ۲۷۰۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۱۴-۲۲۳۔ دلائل الامامت صفحہ ۱۴۶-۱۴۸۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۴۸-۳۵۰۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۲۴۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۱۵۰۔

[2] ارشاد مفید صفحہ ۲۷۹-۲۸۳۔ دلائل الامامت صفحہ ۱۴۸-۱۵۴۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۲۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۲۳-۳۲۷۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳۔ صفحہ ۱۵۰۔

[3] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۸۶۔ ارشاد مفید صفحہ ۲۸۴-۲۹۶۔ دلائل الامامت صفحہ ۱۷۵-۱۷۷۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۲۵-۲۴۶۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۱۵۰۔

امام ہشتمؑ اپنے والد ماجد کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور اپنے بزرگوں کے تعارف سے عہدۂ امامت پر فائز ہوئے۔ اپنی امامت کا کچھ حصہ ہارون الرشید عباسی خلیفہ کے زمانے میں گزارا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے امین عباسی اور پھر مامون عباسی کے ہمعصر بھی رہے۔

ہارون الرشید کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں مامون اور امین میں اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجہ میں خونریز جنگیں شروع ہو گئیں اور آخر کار امین مارا گیا اور مامون نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔[1]

اس وقت تک علوی سادات کے لئے بنو عباس کی سیاست بڑی سخت اور خونی تھی جو کہ روز بروز سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور جب بھی علویوں میں سے کوئی شخص اپنی تحریک شروع کرتا تو خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور یہ امر خلافت کے لئے سخت مشکلات پیدا کر دیتا تھا۔

اگرچہ اہلبیتؑ کے شیعہ رہنما اور امامؑ اس زمانے تک تحریک اور انقلاب شروع کرنے والوں کے ساتھ تعاون اور مداخلت نہیں کیا کرتے تھے لیکن شیعہ جن کی تعداد اس زمانے میں بھی قابلِ توجہ تھی ہمیشہ اہلبیتؑ کے ائمہؑ کو اپنا دینی رہنما اور واجب الاطاعت جانتے تھے اور ان کو ہی پیغمبر اکرمؐ کے حقیقی خلفاء مانتے تھے کیونکہ خلافت اور دار الخلافہ قیصر و کسریٰ کے درباروں کا نمونہ بن چکے تھے اور ایک لاابالی عیاش گروہ کے ذریعے ملکی امور انجام پاتے تھے۔ شیعہ ان حکومتوں کو ناپاک اور اپنے ائمہؑ کی شان کے خلاف جانتے تھے۔ لہٰذا اس حالت کا جاری رہنا اور ترقی کرنا بھی حکومت اور خلافت کے لئے سخت خطرناک تھا اور یہ خطرہ ہمیشہ در پیش تھا۔

مامون نے سوچا کہ ان مشکلات کو اس کے آباء و اجداد کی ستر سالہ پرانی سیاست حل نہ کر سکی تھی لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ ایک نئی سیاسی چال کے ذریعے ان مشکلات کو ختم کر دے اور وہ یہ تھی کہ امام ہشتمؑ کو اپنا ولی عہد (جانشین) بنا لے اور اس طرح آئندہ کے لئے ہر ایسی مشکل کا حل تلاش کرے، کیونکہ جب علوی سادات اپنے آپ کو خلافت کا حصہ دار سمجھ لیں گے، اس کے

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۸۸۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۳۷۔

علاوہ شیعہ بھی اپنے امامؑ کو خلافت کا جانشین دیکھ لیں گے جس کو وہ ہمیشہ ناپاک اور پلید کہتے آئے ہیں تو اس وقت وہ معنوی اخلاص و ارادت جو وہ ائمہ اہلبیتؑ کے بارے میں رکھتے ہیں آہستہ آہستہ زائل ہو جائے گی اور اس طرح ان کے مذہبی عقائد بھی مٹ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہ خطرہ بھی خود بخود مٹ جائے گا جو ان کو خلافت اور ریاست سے رہتا ہے۔[1]

ظاہر ہے کہ اصل مقصد حاصل ہو جانے کے بعد مامون کے لئے امامؑ کو ختم کر دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مامون نے اپنے اس فیصلے اور عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امامؑ کو مدینہ سے مرو میں بلایا۔ سب سے پہلے آپ کو خلافت کی اور اس کے بعد جانشینی کی پیشکش کی۔ لیکن آپ نے مختلف طریقوں سے معذرت کر کے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ لیکن آخر کار مامون نے بڑے اصرار سے جانشینی پر آپ کو راضی کر لیا۔ اور امامؑ نے بھی مجبوراً اس شرط پر یہ عہدہ قبول کر لیا کہ حکومت کے کاروبار یا کسی کو منصب دینے یا معزول کرنے میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔[2]

یہ واقعہ ۲۰۰ھ میں پیش آیا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد مامون کو شیعوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ترقی اور اپنے امامؑ سے بہت زیادہ محبت اور عوام کے استقبال اور حتیٰ کہ خود اس کے سپاہیوں اور اعلیٰ عہدیداروں کی توجہ امامؑ کی طرف زیادہ ہو جانے سے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ اس کا سدِباب کرنے پر آمادہ ہوا۔ اسی وجہ سے اس نے آپ کو زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔

شہادت کے بعد امام ہشتمؑ کو ایران کے شہر طوس میں جس کو اب مشہد کہتے ہیں دفن کیا گیا۔

مامون الرشید عقلی علوم کی طرف بہت زیادہ مائل تھا اور اس سلسلے میں علوم عقلی کے عربی میں ترجمے کرائے۔ وہ علمی مجالس بھی منعقد کیا کرتا تھا جن میں مختلف مذاہب کے علماء اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ اس طرح وہاں علمی مناظرے ہوا کرتے تھے۔ امام ہشتمؑ بھی ان مجالس میں شرکت کیا کرتے تھے اور دوسرے مذاہب کے علماء کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔

---

[1] دلائل الامامت صفحہ ۱۹۷۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۶۳۔

[2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۸۹۔ ارشاد مفید صفحہ ۲۹۰۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۳۷۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۵۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۶۳۔

ان مجالس اور مناظروں کو بہت زیادہ شیعہ احادیث میں نقل کیا گیا ہے۔[1]

امام نہمؑ

امام محمد بن علی (جن کا لقب تقی یا امام جواد اور کہیں ابن الرضا بھی ملتا ہے) آٹھویں امامؑ کے فرزند ہیں جنکی ۱۹۵ھ میں مدینہ میں ولادت ہوئی۔ شیعہ روایات کے مطابق ۲۲۰ھ میں عباسی خلیفہ معتصم کے ایماء پر آپ کی بیوی نے جو عباسی خلیفہ مامون کی بیٹی تھی، آپ کو زہر دے کر شہید کیا۔ آپ اپنے جدِ امجد امام ہفتمؑ کے پہلو میں کاظمیہ (عراق) میں مدفون ہیں۔

آپ اپنے والد ماجد کے بعد خدا کے حکم اور بزرگوں کے تعارف سے امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ امام نہمؑ اپنے والد کی وفات کے وقت مدینہ میں تھے۔ اس کے بعد مامون نے آپ کو بغداد میں بلایا جو اس زمانے میں خلافت کا مرکز یا دارالخلافہ تھا۔ ظاہری طور پر آپ کے ساتھ بہت زیادہ شفقت اور محبت روا رکھی گئی، یہاں تک کہ خلیفہ نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی آپ سے کر دیا اور بغداد میں ہی ٹھہرا لیا۔ درحقیقت مامون یہ چاہتا تھا کہ اس ذریعے سے امامؑ کو گھر کے اندر اور گھر کے باہر نظر بند رکھے تاکہ آپ پر پورا کنٹرول کر سکے۔

ایک عرصہ تک امامؑ بغداد میں تشریف فرما رہے، پھر مامون کی اجازت سے مدینہ چلے گئے اور مامون کے آخری عہد تک مدینہ میں ہی قیام پذیر رہے، مامون کی وفات پر معتصم باللہ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو امام نہمؑ کو دوبارہ مدینہ سے بغداد بلایا گیا، اس کے بعد ان پر پابندی عائد کر دی گئی اور آخر کار جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے معتصم باللہ کے حکم یا اشارے سے امامؑ کی بیوی کے ذریعے آپ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا گیا۔[2]

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۵۱۔ کتاب احتجاج تالیف احمد بن علی بن ابیطالب الطبرسی طبع نجف ۱۳۸۵ھ جلد ۲ صفحہ ۱۷۔ ۲۳۷۔

[2] ارشاد مفید صفحہ ۲۹۷۔ اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۹۲۔ ۴۹۷۔ دلائل الامامت صفحہ ۲۰۱۔ ۲۰۹۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۷۷۔ ۳۹۹۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۴۷۔ ۲۵۸۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۵۸۔

امام دہمؑ

امام علی بن محمدؑ (جن کا لقب نقی اور کہیں امام ہادی بھی ملتا ہے) دسویں امامؑ ہیں۔ آپ امام نہمؑ کے فرزند ہیں، ۲۱۲ھ کو مدینہ منورہ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۲۵۴ھ میں (شیعہ روایات کے مطابق عباسی خلیفہ معتز باللہ نے آپ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا۔ [1]

دسویں امامؑ سات عباسی خلیفوں یعنی مامون، معتصم، واثق، متوکل، منتصر، مستعین اور معتز کے ہمعصر رہے۔

معتصم باللہ کے عہد خلافت ۲۲۰ھ میں جب ان کے والد ماجد امام نہمؑ کو بغداد میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا تھا اس وقت آپ مدینہ منورہ میں تھے اور خدا کے حکم اور اپنے آباء و اجداد یعنی گزشتہ ائمہ علیہم السلام کے تعارف سے آپ امامت کے منصب پر فائز ہوئے اور اسلامی تعلیمات دینی شروع کیں، یہاں تک کہ عباسی خلیفہ متوکل کا زمانہ آیا۔

خلیفہ متوکل نے ۲۴۳ھ میں دشمنوں کی شکایات سن سن کر حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو حکم دیا کہ دسویں امامؑ کو مدینہ سے سامرا منتقل کر دیا جائے جو اس زمانے میں خلافت کا مرکز تھا۔ اس نے امامؑ کو ایک محبت بھرا خط لکھا جس میں آپ کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کی گئی تھی اور آپ سے تشریف لانے اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ [2]

(جب آپ تشریف لے آئے تو) آپ کے سامرا میں داخل ہونے کے بعد ظاہری طور پر تو کوئی اقدام نہ کیا گیا لیکن آپ کی توہین اور ہتک کے اسباب فراہم کر دیئے گئے اور آپ کی

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۹۷۔ ۵۰۲۔ ارشاد مفید صفحہ ۳۰۷۔ دلائل الامامت ۲۱۶۔۲۲۲۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۵۹۔ ۲۶۵۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۶۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۴۰۱۔ ۴۲۰۔

[2] ارشاد مفید صفحہ ۳۰۷۔۳۱۳۔ اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۰۱۔ فصول المہمہ صفحہ ۲۶۱۔ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۵۹۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۴۱۷۔ اثبات الوصیۃ صفحہ ۱۷۶۔ تاریخ یعقوبی جلد ۳۔ صفحہ ۲۱۷۔

توہین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا۔ کئی بار آپ کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور خلیفہ کے حکم سے آپ کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی۔

خلیفہ متوکل عباسی، خاندانِ رسالت کی دشمنی میں دوسرے خلفاء کے مقابلے میں بے مثال تھا۔ خصوصاً حضرت علیؑ کا سخت دشمن تھا اور آپ کی شان میں کھلم کھلا توہین آمیز الفاظ کہا کرتا تھا یا آپ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک شخص کو مامور کیا ہوا تھا جو بھری محفل میں آپ کی نقلیں اتارا کرتا تھا اور خلیفہ قہقہے لگا کر ہنسا کرتا تھا۔ ۲۳۷ھ میں اس کے حکم سے کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقبرہ، گنبد اور آس پاس کے کئی مکانات کو مسمار کر کے زمین کے ساتھ یکساں کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے حکم سے امام کے مقبرے پر پانی چھوڑا گیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ امام کے مقبرہ کی جگہ پر ہل چلا کر کھیتی باڑی کی جائے تاکہ امامؑ کے مزار کی جگہ اور آپ کا نام بالکل مٹ جائیں۔[1]

متوکل کے زمانے میں علوی سادات کے حالات رقت بار اور ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں کے پاس تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے تک موجود نہ تھے اور بعض کے پاس صرف ایک بوسیدہ سی چادر ہوا کرتی جس کو اوڑھ کر وہ باری باری نماز ادا کیا کرتی تھیں۔[2] اس قسم کے دباؤ ان علوی خاندانوں پر بھی وارد ہوئے جو مصر میں قیام پذیر تھے۔

امام دہم متوکل کے شکنجوں کو برداشت کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے چلا گیا، اس کے بعد منتصر، مستعین اور معتز باری باری خلیفہ بنے۔ معتز کے ایما پر آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

امام یازدہم (گیارہویں امامؑ)

امام حسن بن علی (عسکری) دسویں امامؑ کے بیٹے ہیں۔ آپ کی ولادت ۲۳۲ھ میں ہوئی (بعض شیعہ روایات کے مطابق) عباسی خلیفہ معتمد باللہ نے زہر دے کر آپ کو شہید کروا دیا۔[3]

---

[1] [2] مقاتل الطالبین صفحہ ۳۹۵-۳۹۶۔

[3] ارشاد مفید صفحہ ۳۱۵۔ دلائل الامامت صفحہ ۲۲۳ فصول المہمہ صفحہ ۲۶۶-۲۷۰۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۴۲۲۔ اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۰۲

گیارہویں امام اپنے والد کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور گزشتہ ائمہ طاہرینؑ کے تقرر سے امامت کے بلند منصب پر فائز ہوئے۔ آپ اپنی سات سالہ امامت کے دوران خلیفہ کی سختیوں اور ظلم وستم کے باعث تقیہ (یعنی جب بس نہ چلے تو جان کے خوف سے خاموشی اختیار کرلینا) کی حالت میں بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے تھے۔ لہٰذا آپ عام لوگوں کو حتیٰ کہ شیعوں کو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، سوائے ان خاص افراد کے جن کو آپ ذاتی طور سے جانتے تھے اس طرح آپ زیادہ تر نظر بندی کی زندگی گزارتے رہے۔[1]

ان تمام سختیوں اور دباؤ کا مقصد یہ تھا کہ سب سے پہلے تو اس زمانے میں شیعوں کی تعداد اور طاقت قابلِ توجہ حد تک پہنچ چکی تھی اور چونکہ شیعہ امامتؑ کے قائل ہیں، یہ بات سب پر واضح اور روشن ہو چکی تھی اور شیعوں کے ائمہؑ بھی جانے پہچانے تھے، اسی لئے ہر خلیفہ، امامِ وقت کو زیادہ سے زیادہ زیرِ نظر اور زیرِ کنٹرول رکھتا تھا۔ اور جس طرح بھی ممکن ہوتا اپنے خفیہ منصوبوں کے ذریعہ ائمہؑ کو ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

دوسرے یہ کہ، خلیفہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ شیعہ گیارہویں امامؑ کے بیٹے پر ایمان رکھتے ہیں اور گیارہویں امامؑ اور اسی طرح گزشتہ ائمہ کی احادیث سے پتہ چلتا تھا کہ یہی فرزند امام مہدی موعودؑ ہونگے جن کے بارے میں حدیثِ متواترہ کے ذریعہ خاص وعام نے اطلاع دی ہے۔[2] اور ان کو بارہواں اور آخری امام مانتے ہیں۔

اسی وجہ سے گیارہویں امامؑ دوسرے تمام آئمہ علیہم السلام سے زیادہ خلیفہ کے زیرِ نظر تھے

---

[1] ارشاد مفید صفحہ ۳۲۴۔ اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۱۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۴۲۹-۴۳۰۔

[2] دیکھئے کتاب صحیح ترمذی جلد ۹ باب "ما جاء فی المهدی" صحیح ابی داؤد جلد ۲ کتاب المهدی۔ صحیح ابن ماجہ جلد ۲ باب "الخروج المهدی"۔ کتاب ینابیع المودت۔ کتاب البیان فی اخبار صاحب الزمان تالیف محمد بن یوسف شافعی۔ کتاب نور الابصار تالیف شبلنجی۔ کتاب مشکوٰۃ المصابیح تالیف محمد بن عبداللہ خطیب۔ صواعق محرقہ تالیف ابن حجر۔ اسعاف الراغبین تالیف محمد الصبان۔ اثبات الہداۃ تالیف محمد بن حسن حُر عاملی۔ بحار الانوار تالیف علامہ مجلسی جلد ۵۱-۵۲۔

اور خلیفۂ وقت بھی پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ جس طرح بھی ہو، شیعہ امامت کی کہانی کو ختم کر دے اور اس دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔

اس طرح جونہی گیارہویں امامؑ کی علالت کی خبر خلیفہ کو پہنچی تو اس نے فوراً آپ کے پاس طبیب اور حکیم بھیجے اور ساتھ ہی اپنے چند قابلِ اعتماد افراد کو آپ کے گھر میں متعین کر دیا جو قاضی تھے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، گھر کے اندر اور باہر کے حالات پر نظر رکھتے تھے۔ امامؑ کی شہادت کے بعد بھی آپ کے خانہ مبارک کی تلاشی لی گئی اور دائیوں کے ذریعے آپ کی کنیزوں کا معائنہ کرایا گیا۔ دو سال تک خلیفہ کے گماشتے آپ کے بیٹے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ بالکل ناامید اور مایوس ہو گئے۔ [1]

گیارہویں امامؑ کو ان کی شہادت کے بعد ان کے گھر کے اندر شہر سامرا میں ان کے والد ماجد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

یہ جان لینا چاہیئے کہ ائمہ اہلبیتؑ نے اپنی زندگی میں علماء، محدثین اور دانشوروں کے بہت زیادہ گروہوں کو زیورِ علم سے آراستہ کیا ہے کہ جن کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اس کتاب کے اختصار کے پیشِ نظر ہم نے ان کے ناموں، حالات اور کتابوں کی فہرستیں لکھنے کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ یہ کتاب مختصر رہے۔ [2]

امام دوازدہم (بارہویں امامؑ)

حضرت مہدی موعود علیہ السلام (جو عام طور پر "امام زمان" اور "صاحب الزمان" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں) گیارہویں امام کے فرزند ہیں اور ان کا نام بھی پیغمبر اکرمؐ کے نام پر یعنی "محمد" ہے۔ آپ کی ولادت ۲۵۵ھ میں سامرا میں ہوئی۔ ۲۶۰ھ یعنی اپنے والد ماجد

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۰۵۔ ارشاد مفید صفحہ ۳۱۹۔

[2] دیکھئے کتاب "رجال کشی"، "رجال طوسی" اور رجال کی دوسری مشہور کتابیں۔

کی شہادت تک ان کے زیر تربیت زندگی گزارتے رہے، لیکن لوگوں سے بالکل الگ اور ان کی نظروں سے پنہاں رہے۔ سوائے خاص شیعوں کے کسی کو آپ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی اور نہ ہی کوئی ان سے ملاقات کر سکتا تھا۔

گیارہویں امامؑ کی شہادت کے بعد جب آپ امامت کے منصب پر فائز ہوئے تو آپ خدا کے حکم سے غائب ہو گئے اور اپنے نائبین کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے تھے اور وہ بھی خاص حالات میں۔[1]

خاص نائبین

حضرت امام مہدی علیہ السلام نے ایک مدت تک عثمان بن سعید عمری کو جو آپ کے دادا اور پھر آپ کے والد کے اصحاب میں سے تھے، ثقہ اور امین بھی تھے، اپنا نائب مقرر کیا۔ ان کے ذریعے شیعوں کے سوالات اور درخواستوں کے جواب دیا کرتے تھے۔

عثمان بن سعید کے بعد ان کے بیٹے محمد بن عثمان امام مہدیؑ کے نائب ہوئے اور ان کی وفات کے بعد ابوالقاسم حسین ابن روح نوبختی آپ کے نائب خاص کی حیثیت سے منصوب ہوئے۔ حسین بن روح کی وفات کے بعد علی بن محمد سمری کو امام مہدیؑ کی نیابت حاصل ہوئی۔

ابھی علی بن محمد سمری کی وفات میں چند دن رہتے تھے (جو ۳۲۹ھ میں فوت ہوئے) کہ امام مہدی علیہ السلام کی طرف سے ایک حکم نامہ جاری ہوا جس میں علی بن محمد سمری کو کہا گیا تھا کہ وہ چھ دن بعد فوت ہو جائیں گے اور اس کے بعد خاص نیابت کا عہدہ ختم ہو جائے گا اور غیبتِ کبریٰ شروع ہو جائے گی اور یہ غیبتِ کبریٰ اس دن تک جاری رہے گی جب اللہ تعالیٰ امام مہدیؑ کے دوبارہ ظہور کا اذن فرمائے گا۔[2]

اس حکم کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام کی غیبت دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے:۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۱ صفحہ ۲-۳۴-۳۴۳-۳۶۶-کتاب الغیبت تالیف محمد بن حسن طوسی طبع دوم صفحہ ۲۱۴-۲۴۳۔
کتاب اثبات الہداۃ جلد ۲ صفحہ ۶، ۷۔

[2] بحار الانوار جلد ۵۱ صفحہ ۳۶۰-۳۶۱-الغیبت تالیف شیخ طوسی صفحہ ۲۴۲۔

۱۔ **غیبتِ صغریٰ** :۔ غیبتِ صغریٰ ۲۶۰ھ سے شروع ہوئی اور ۳۲۹ھ تک جاری رہی اس غیبت کا عرصہ ۷۰ سال ہے۔

۲۔ **غیبت کبریٰ** :۔ غیبتِ کبریٰ کا زمانہ ۳۲۹ھ سے شروع ہوا، اور جب تک خدا تعالیٰ چاہے گا یہ غیبت جاری رہے گی۔ پیغمبر اکرمؐ ایک حدیث شریف میں فرماتے ہیں (جس پر تمام اسلامی فرقوں کو اتفاق ہے) :۔

"اگر دنیا کی زندگی ایک دن بھی باقی رہتی ہوگی تو بھی خداوند تعالیٰ اس دن کو اس قدر لمبا کر دے گا کہ امام مہدی (علیہ السلام) جو میرے بیٹے ہیں تشریف لائیں گے اور اس دنیا کو عدل و انصاف سے مالامال کر دیں گے، اگرچہ یہ دنیا ظلم و ستم سے بھری ہوئی کیوں نہ ہو۔" [1]

امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (عام عقیدے کے مطابق)

ہم نے نبوّت اور امامت کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ عام ہدایت کے قانون کے مطابق جو ہر قسم کی آفرینش اور کائنات میں جاری و ساری ہے، بنی نوع انسان ضرورت کے لحاظ سے ایک ایسی طاقت رکھتے ہیں (وحی و نبوّت کی طاقت) جو ان کو کمالِ انسانیّت اور سعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ کمال و ترقی اور سعادت جو انسان کے لئے امکان پذیر اور قابل وقوع نہ ہو تو اس کی طاقت اور قوّت منسوخ اور باطل ہو جائے گی، لیکن آفرینش اور فطرت میں منسوخی یا ابطال موجود ہی نہیں ہے۔

ایک اور بیان کے مطابق جب سے انسان اس دنیا میں سکونت اور قیام پذیر ہے، اسی دن سے اس کو ہمیشہ ایک ایسی اجتماعی زندگی کی آرزو اور خواہش رہی ہے جو حقیقی سعادت اور

---

[1] مثال کے طور پر عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لو لم یبق من الدنیا الّا یومٌ واحداً لطول اللہ ذٰلک الیوم حتیٰ یبعث فیہ رجلاً من امّتی و من اھل بیتی یواطی اسمہ اسمی یملا الارض قسطاً و عدلاً کما ملئت جوراً و ظلماً۔ (فصول المہمہ صفحہ ۲۷۱)

خوشحالی پر مبنی ہو اور اس سعادت تک پہنچنے کے لئے لگاتار کوشش میں مصروف ہے۔ اگر یہ آرزو اور خواہش یا امید پوری ہونی محال ہوتی یا اس کا کوئی بیرونی وجود نہ ہوتا تو ہرگز انسان کے دل میں ایسی خواہش یا امید پیدا ہی نہ ہوتی۔ اور اگر آلت تناسل نہ ہوتی تو جنسی یا نفسانی خواہش بھی پیدا نہ ہوتی۔

اس لحاظ سے ضرورت (جبر) کے مطابق اس دنیا کے مستقبل میں بھی وہ دن ضرور آئے گا، جس دن اس کی یہ آرزو پوری ہو جائے گی اور انسانی معاشرہ عدل و انصاف سے بھر جائے گا اور تمام بنی نوع انسان آپس میں پیار، محبت اور صلح و صفا سے زندگی بسر کریں گے اور اس دن ہر شخص فضیلت کے انتہائی درجے پر پہنچ جائے گا۔

البتہ ایسی حالت کا پیدا ہونا بھی خود انسان کے ہاتھ میں ہوگا، پھر ایسے معاشرے کا رہنما اور رہبر، انسانی دنیا کا نجات دہندہ اور دوسرے الفاظ میں "امام مہدیؑ" ہوگا۔

دنیا کے مختلف مذاہب مثلاً ثنویت، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور اسلام وغیرہ سب میں ایسے شخص کے بارے میں اشارے ملتے ہیں جو دنیا کو نجات دلائے گا اور ان تمام مذاہب میں اس شخص کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اگرچہ ایسے شخص کے بارے میں اختلافِ نظر موجود ہے کہ وہ کون ہوگا، لیکن اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کی متفق علیہ احادیث میں وہ شخص: **المهدی من ولدی**، یعنی مہدی موعودؑ میری اولاد (میری نسل) میں سے ہوگا، اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔

امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (خاص عقیدے کے مطابق)

ان بے شمار احادیث کے علاوہ جو پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ سے خاص و عام ذرائع سے امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں کہ آپ پیغمبر اکرمؐ کی نسل اور اولاد سے ہوں گے اور انسانی معاشرے کو حقیقی کمال و خوش بختی تک پہنچائیں گے اور اس معاشرے

کو ایک معنوی زندگی عطا فرمائیں گے۔[1] بہت زیادہ دوسری احادیث و روایات بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام مہدیؑ، حضرت امام حسن عسکریؑ (گیارہویں امامؑ) کے حقیقی فرزند ہیں[2] جو پیدا ہوئے ہیں لیکن غیبتِ کبریٰ کے بعد ظاہر ہونگے اور اس دنیا کو عدل و انصاف سے مالا مال کر دیں گے کیونکہ اس وقت یہ دنیا ظلم و جور سے بھری ہوئی ہوگی۔

---

[1] مثال کے طور پر: قال ابوجعفر علیہ السلام: اذا قام قائمنا وضع اللہ یدہ علی رؤس العباد فجمع بہ عقولھم وکملت بہ احلامھم (بحار الانوار جلد ۵۲ صفحہ ۳۲۸، ۳۳۶)

قال ابوعبداللہ علیہ السلام: العلم سبعة وعشرون حرفاً فجمیع ما جائت بہ الرسل حرفان فلم یعرف الناس حتی الیوم غیر الحرفین۔ فاذا قام قائمنا اخرج الخمسة والعشرین حرفاً فبثھا فی الناس وضم الیھما الحرفین حتی یبثھا سبعة وعشرین حرفاً (بحار الانوار جلد ۵۲ صفحہ ۳۳۶)

[2] نمونے کے طور پر: قال علی بن موسی الرضا علیہ السلام فی حدیث (الی ان قال) الامام بعدی محمد ابنی وبعد محمد ابنہ علی وبعد علی ابنہ الحسن وبعد الحسن ابنہ الحجة القائم المنتظر فی غیبتہ المطاع فی ظھورہ لو لم یبق من الدنیا الا یوم واحد لطول اللہ ذلک الیوم حتی یخرج فیملاء الارض، عدلاً کما ملئت جوراً واما متی فاخبار عن الوقت ولقد حدثنی ابی عن ابیہ عن آبائہ عن علی ان النبی قیل لہ یا رسول اللہ متی یخرج القائم من ذریتک فقال: مثلہ مثل الساعة لا یجلیھا لوقتھا الا ھو ثقلت فی السموٰت والارض لا یاتیکم الا بغتة (بحار الانوار جلد ۵۱ صفحہ ۱۵۴)

صفر بن ابی دلف قال سمعت ابا جعفر محمد بن الرضا علیہ السلام یقول: الامام بعدی ابنی علی، امرہ امری وقولہ قولی وطاعتہ طاعتی، والامام بعدہ ابنہ الحسن، امرہ امر ابیہ وقولہ قول ابیہ وطاعتہ طاعة ابیہ، ثم سکت، فقلت لہ یا ابن رسول اللہ فمن الامام بعد الحسن، فبکی بکاء شدیداً ثم قال: ان من بعد الحسن ابنہ القائم بالحق المنتظر (بحار الانوار جلد ۵۱ صفحہ ۱۵۸)

موسیٰ بن جعفر البغدادی قال سمعت ابا محمد الحسن بن علی یقول: کأنی بکم وقد اختلفتم بعدی فی الخلف منی اما ان المقر بالائمة بعد رسول اللہ المنکر لولدی کمن اقر بجمیع انبیاء اللہ ورسلہ ثم انکر نبوة محمد رسول اللہ والمنکر لرسول اللہ کمن انکر جمیع الانبیاء لان طاعة آخرنا کطاعة اولنا والمنکر لاٰخرنا کالمنکر لاولنا اما ان لولدی غیبة یرتاب فیھا الناس الا من عصمہ اللہ..

(بحار الانوار جلد ۵۱ صفحہ ۱۶۰)

چند مسائل اور انکے جوابات

شیعوں کے مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس فرقے کے اعتقاد کے مطابق امام نائبؑ کی عمر اب تک بارہ سو (۱۲۰۰) برس ہونی چاہیئے، حالانکہ انسان کی عمر ہرگز اتنی لمبی نہیں ہوتی ؟

جواب : اس اعتراض کی بنیاد بعید از قیاس ہے کیونکہ اتنی لمبی عمر بلکہ اس سے بھی لمبی عمر بعید نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص خصوصاً امام غائبؑ کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ اور دوسرے ائمہ اہلبیتؑ سے جو احادیث نقل ہوئی ہیں، ان کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ احادیث امام غائبؑ کی زندگی کو ایک معجزے کے طور پر بیان کرتی ہیں۔

البتہ معجزہ اور کرامت محال نہیں ہے، لیکن سائنس کے ذریعے بھی خارق العادہ یعنی معجزے کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

اس امر کو بھی نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ وہ وجوہات اور اسباب و علل جو دنیا میں کام کر رہے ہیں کیا صرف وہی ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کو پہچانتے ہیں اور ایسے ہی دوسرے عناصر اور اسباب و علل جن کے بارے میں ہمیں اطلاع نہیں ہے یا ان کے اثرات اور کاموں کو ہم دیکھ نہیں سکتے یا ان کو نہیں پہچانتے ہیں، وہ بالکل موجود ہی نہیں ؟ اس لحاظ سے ممکن ہے کہ انسانوں میں سے ایک شخص یا چند اشخاص میں وہ عوامل، عناصر یا اسباب پیدا ہو جائیں کہ خدا کے حکم سے ان کی عمر ہزار سال یا چند ہزار سال تک پہنچ جائے، یہی وجہ ہے کہ سائنس، ڈاکٹری یا علم حکمت ابھی تک وہ طریقہ ایجاد کرنے سے ناامید اور مایوس نہیں ہوئے جس کے ذریعے بہت طولانی عمریں انسانوں کو مل جائیں۔

یہ اعتراض خصوصاً مختلف مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت یا اسلام رکھنے والوں سے بہت تعجب کی بات ہے کیونکہ یہ سب لوگ خارق العادۃ یا خدا کے انبیاءؑ کے معجزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو مانتے ہیں۔

شیعوں کے مخالفین کو اعتراض ہے کہ شیعہ، امام کو دینی احکام و حقائق بیان کرنے اور اور عوام کی راہنمائی کے لئے ضروری خیال کرتے اور امام کی غیبت اس امر کے خلاف اور متضاد ہے کیونکہ وہ امام جو غائب ہو چکا ہے اور لوگوں کو اس تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس کے ہونے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر خداوند کریم چاہے کہ دنیا کی اصلاح کے لئے کوئی امام پیدا کرے تو اس بات پر قادر ہے کہ جب اور جس وقت چاہے اور جب امام کی ضرورت ہو، اس کو پیدا کر دے، اس لئے چند ہزار سال وقت سے پہلے اس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب : ایسے لوگوں کو امامت کے معنی اور اس کی حقیقت معلوم ہی نہیں ہے، کیونکہ امامت کے بارے میں بحث کے دوران واضح ہو گیا ہے کہ امام کا فرض صرف یہی نہیں کہ صوری اور ظاہری رہنمائی کرے بلکہ جیسا کہ امام کے ذمے لوگوں کی ظاہری رہنمائی ہے، اسی طرح باطنی ولایت اور راہبری کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے اور وہی لوگوں کی معنوی زندگی کو منظم اور مرتب کرتا ہے اور اعمال کے حقائق کو خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے لاتا ہے اور پھر واپس خدا کی طرف پہنچاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ امام کی جسمانی غیبت یا حاضری کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور امام باطن کے ذریعے لوگوں کے دلوں اور روحوں میں اثر کرتا ہے۔ اگرچہ امام ظاہری طور پر جسمانی حیثیت سے پوشیدہ ہیں لیکن ان کا ہونا ہمیشہ ضروری ہے۔ اگرچہ ان کے ظاہر ہونے اور ان کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی ابھی تک نوبت نہیں آئی۔

خاتمہ — شیعوں کا معنوی پیغام

اہل دنیا کو شیعوں کا معنوی پیغام ایک فقرے سے زیادہ نہیں ہے اور وہ یہ ہے :-

" خدا کو پہچاننے اور خداشناسی کا ایسا طریقہ اختیار کریں تاکہ سعادت مند ہو کر نجات پا جائیں "

اور یہی وہ فقرہ ہے کہ رسول خداؐ نے اپنی عالمی دعوت کو پہلی بار اسی فقرے سے شروع کیا تھا :

" اے لوگو! خدا کو ایک جانو اور اس کا اقرار کر لو (سچے دل سے اس پر ایمان لے آؤ) تاکہ نجات پا جاؤ "

اس بیان کی وضاحت میں ہم اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ :

ہم اپنی فطرت کے مطابق اس دنیا میں بہت زیادہ دنیاوی لذّتوں اور مادّی مقاصد کے دلدادہ ہیں یعنی بہترین اشیائے خوردنی اور نوشیدنی، اچھے اچھے لباس، رہنے کے لئے محلّات، دیکھنے کے لئے خوبصورت مناظر، خوبصورت اور دلنواز بیوی، اچھے اور مہربان دوست، بہت زیادہ دولت، طاقت اور سیاست کے ذریعے بلند مرتبے اور جاہ و مقام اور حکومت وغیرہ حاصل کرنا اور اپنے عقائد و نظریات کے خلاف ہر چیز کو ختم کر دینا وغیرہ۔ دنیا میں ہم ایسے کام چاہتے ہیں۔

لیکن ہم اپنی خداداد سرشت کے ساتھ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ تمام لذّتیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں نہ کہ انسان ان کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہ کہ یہ سب چیزیں انسان کے پیچھے ہونی چاہئیں نہ کہ انسان ان کے پیچھے بھاگتا پھرے۔

پیٹ یا پیٹ کا نچلا حصہ زندگی کا انتہائی مقصد ہونا، گائے، بھیڑ جیسے جانوروں کی منطق ہے اور اسی طرح چیرنا پھاڑنا اور دوسروں کو تکلیف دینا، شیر، بھیڑیئے، لومڑی اور اسی قسم کے درندوں کی منطق ہے۔ انسان کی منطق، فطری عقل کی منطق ہے اور بس۔

عقل کی منطق اپنی حقیقت بینی کے ساتھ ہمیں حق و حقیقت کا پیروکار ہونے کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ کہ اپنی دل پسند ہر قسم کی شہوت رانی، تکبّر اور خود غرضی وغیرہ کی طرف۔ عقل کی منطق انسان کو خدائی فطرت کا حصہ جانتی ہے جس میں مکمل آزادی اور مرضی موجود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے انسان اپنے آپ کو اس دنیا و کائنات کا فرمان روا اور حاکم سمجھ بیٹھا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس سرکش فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق مطیع کرے اور اس پر فتح حاصل کرے وہ خود بھی اس فطرت کے ہاتھ میں کھلونا بن کر اس کا فرمان بردار ہو گیا ہے۔

عقل کی منطق انسان کو دعوت دیتی ہے کہ اس جہانِ فانی کی زندگی سے جو کچھ سمجھ سکا ہے اس پر غور کرے، یہ کہ کائنات کا نظام، ہستی اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے وہ خود بخود

پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی بنیاد ایک لامتناہی منبع ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کائنات میں ہر قسم کی خوبصورت یا بدصورت موجودات خواہ زمین پر ہو یا آسمان پر ہو یا انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک مستقل حقیقت کی صورت میں جلوہ گر ہو۔ ایک دوسری حقیقت کی پناہ میں قائم ہے (یعنی ایک دوسری حقیقت کے ساتھ جو مستقل اور ہمیشگی ہے، اس کی موجودیت وابستہ ہے) اور اسی کے زیر اثر پیدا اور آشکار ہوئی ہے، نہ کہ خود بخود اور نہ ہی یہ وجود اس کا اپنا وجود ہے۔ اور جیسا کہ گزشتہ تمام حقیقتیں، طاقتیں اور عظمتیں جو کہ آج ایک افسانہ معلوم ہوتی ہیں، موجودہ حقیقتیں بھی مستقبل میں افسانہ معلوم ہوں گی اور آخرکار ہر چیز ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

صرف خدا کی ذات ہی ہے جس کو زوال نہیں ہے اور کائنات کی سب چیزیں اسی کی ذات کے زیر سایہ زندگی اور حیات رکھتی ہیں اور اسی کی ذات کی روشنی میں روشن اور پیدا ہوتی ہیں۔

جب انسان کے اندر یہ ادراک پختہ ہو جائے تو اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے زندگی کا خیمہ پانی کے ایک بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور وہ اپنے سامنے مشاہدہ کرتا ہے کہ جہان اور اہلِ جہان ایک لامتناہی اور لازوال ہستی اور ایسے ہی لازوال زندگی، طاقت، علم اور کمال پر تکیہ کرتے ہیں اور جہان یا کائنات کا ہر مظہر اس کے لئے ایسا دریچہ ہے کہ جس میں سے ہر مظہر اپنے اپنے اندازے کے مطابق اپنی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے جو ابدی دنیا ہے۔

اس وقت انسان اپنی حقیقت اور اپنی آزادی یا ہر چیز کی حقیقت کو اس کے اصلی مالک سے منسوب کرتا ہے اور دنیا کی تمام چیزوں سے دل ہٹا کر صرف خدائے یکتا کے ساتھ مل جاتا ہے اور اس (خدا) کی عظمت و شوکت کے مقابلے میں کسی اور چیز کے سامنے اپنا سر خم نہیں کرتا۔

اس وقت اپنے پاک پروردگار کی سرپرستی اور ولایت کے دائرے میں آجاتا ہے، اس وقت جس چیز کو بھی پہچانتا ہے، خدا کی ذات کے ذریعے سے پہچانتا ہے اور خدا کی رہبری و ہدایت کے ساتھ پاک اخلاق اور نیک اعمال (کیونکہ دین اسلام کے معنی ہیں حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا جو آئین فطرت ہے) سے مزیّن ہو جاتا ہے۔

یہ ہے کمالِ انسانیّت اور انسانِ کامل کا آخری مقام اور درجہ، یعنی امام جو کہ خدا کی عنایت اور مہربانی سے اس مقام پر پہنچا ہوا ہوتا ہے، اور جو لوگ علم و اخلاق سیکھ کر اس مقام پر پہنچتے ہیں، اپنے اختلافِ درجات کے باوجود امام کے حقیقی پیرو ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خداشناسی اور امام شناسی ہرگز ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہیں جیسا کہ خداشناسی کو خودشناسی (خودی یعنی اپنے آپ کو پہچاننے) سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو شخص اپنی زندگی، اپنی حقیقت اور اپنی ذات کو پہچان لے وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی حقیقی ذات کو پہچان لیتا ہے یعنی:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

C. 1 (19.07.12 - Than MRS)

SHI'A IN ISLAM

BY

ALLAMA M. H. TABĀTABĀI

TRANSLATED BY

DR. SHAHID CHOUHDARY

ب

HI'AH IN ISLAM

Allamah Sayid Muhammad Husayn Tabataba'i

انصاریان پبلیکیشنز
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷
قم۔ جمہوری اسلامی ایران
فون نمبر: ۷۷۴۱۷۴۴ فیکس نمبر: ۰۰۹۸_۲۵۱_۷۷۴۲۶۴۷

www.ansariyan.net